علم الاقتصاد

جس کا معروف نام علم سیاستِ مدن ہے

شیخ محمد اقبال

ایم۔اے۔اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

اقبال اکادمی پاکستان

جملہ حقوق محفوظ

ناشر
پروفیسر ڈاکٹر بصیرہ عنبرین
ناظم
اقبال اکادمی پاکستان
حکومت پاکستان
قومی ورثہ وثقافت ڈویژن
چھٹی منزل، ایوان اقبال، ایجرٹن روڈ، لاہور
Tel: [+92-42] 36314510, 99203573
Fax: [+92-42] 36314496
Email: info@iap.gov.pk
Website: www.allamaiqbal.com

ISBN: 978-969-416-502-8

طبع اول	:	۱۹۶۱ء
طبع دوم	:	۱۹۷۷ء
طبع سوم	:	۲۰۱۸ء
طبع چہارم	:	۲۰۲۱ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۵۰۰روپے
مطبع	:	فریدیہ آرٹ پریس انٹرنیشنل، لاہور

محل فروخت: ۱۱۶- میکلوڈ روڈ، لاہور، فون ۳۷۳۵۷۲۱۴

فہرست

پیش لفظ از ممتاز حسن ۵

مقدمہ از ڈاکٹر انور اقبال قریشی ۱۵

پیش کش ۲۳

دیباچۂ مصنف ۲۵

حصّۂ اوّل

علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریقِ تحقیق ۳۱

حصہ دوم- پیدائشِ دولت

باب اوّل: زمین ۴۹

باب دوم: محنت ۵۷

باب سوم: سرمایہ ۶۹

باب چہارم: کسی قوم کی قابلیت پیدائشِ دولت کے لحاظ سے ۷۵

حصہ سوم- تبادلۂ دولت

باب اوّل: مسئلہ قدر ۸۹

باب دوم: تجارت بین الاقوام ۱۰۷

باب سوم: زرِ نقد کی ماہیت اور اس کی قدر ۱۲۱

باب چہارم: حق الضرب ۱۳۵

باب پنجم: زرِ کاغذی ۱۴۳

باب ششم: اعتبار کی ماہیت و مقاصد اور اس کا اثر اشیاء کی قیمتوں پر ۱۴۹

حصہ چہارم- پیداوارِ دولت کے حصہ دار

باب اول: لگان ۱۵۵

باب دوم: ساہوکار کا حصّہ یا سود ۱۶۱

باب سوم: مالک یا کارخانہ دار کا حصّہ یا منافع ۱۶۷

باب چہارم: محنتی کا حصّہ یا اجرت ۱۷۵

باب پنجم: مقابلۂ ناکامل دستکاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے ۱۸۵

باب ششم: سرکار کا حصہ یا مال گذاری ۱۹۱

حصہ پنجم

باب اول: آبادی- وجہ معیشت ۱۹۹

باب دوم: جدید ضروریات کا پیدا ہونا ۲۰۷

باب سوم: صرفِ دولت ۲۱۱

ضمیمہ ۲۱۳

پیش لفظ

اقبال کی علم الاقتصاد ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کی دوسری اشاعت کی نوبت نہیں آئی۔ اور اشاعت تو درکنار یہ کتاب نظروں سے ایسی غائب ہوئی کہ کہیں سے ایک نسخہ مہیا کرنا بھی دشوار ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ خود اقبال نے اپنی اس تصنیف کو کبھی کوئی اہمیت نہیں دی۔ میری ایک عرصہ سے یہ تمنا تھی کہ علمی دنیا کو اقبال کی اس قدیم اور گراں مایہ تصنیف سے دوبارہ روشناس کرایا جائے۔ خوش قسمتی سے لاہور کی پبلک لائبریری میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہو گیا۔ اسے عاریتاً اقبال اکادمی کے لیے حاصل کیا گیا اور کراچی میں اس نسخے کی ایک عکسی نقل تیار کی گئی۔ موجودہ نسخہ اسی عکس پر مبنی ہے۔

علم الاقتصاد اُردو زبان میں جدید معاشیات پر پہلی کتاب ہے۔ اس کے بہت بعد پروفیسر الیاس برنی، پروفیسر حبیب الرحمٰن اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی مختلف کتابیں اس موضوع پر شائع ہوئیں اور ان کے علاوہ اگرچہ دوسرے مصنّفین نے بھی، خصوصاً حیدر آباد میں، وقتاً فوقتاً کچھ کتابیں اور مقالے لکھے۔ مگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو معاشیات پر اُردو میں کتابوں کی کثرت نہیں ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے علم کے اس شعبے سے کسی زمانے میں بھی کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔ گزشتہ دور میں غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی ہی ایک ایسے مفکر ہیں جنھوں نے انسانی تہذیب و تمدن اور ان کے عروج و زوال کے مطالعے کے سلسلے میں معاشی اور اقتصادی عناصر و عوامل کا جائزہ لیا یا سید احمد خاں ہیں جنھوں نے اسباب بغاوت ہند ۱۸۵۷ء کی کش مکش کے معاشی پہلوؤں پر تبصرہ کیا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں اُردو کے مشہور انشاء پرداز مہدی حسن نے اپنے آپ کو مہدی افادی الاقتصادی لکھا، مگر اقتصادیات کے موضوع پر ان کی کوئی مستقل کوشش منظر عام پر نہیں آئی۔ اسلامی معاشیات کے موضوع پر بھی مناظر احسن گیلانی، حفظ الرحمٰن سیوہاروی، ڈاکٹر انور اقبال

قریشی اور ڈاکٹر یوسف الدین کی تصنیفات کے علاوہ اُردو میں کم ہی لکھا گیا ہے۔ اس لحاظ سے اقبال کی علم الاقتصاد اُردو میں اپنی اوّلیت اور اہمیت کے لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتی ہے۔

علم الاقتصاد کی یہ دوسری اشاعت اٹھاون سال بعد اقبال اکادمی کے زیر اہتمام عمل میں آرہی ہے۔ یہ اکادمی کی سعادت اور خوش بختی ہے کہ اسے اس اہم تصنیف کو زمانے کی فراموش کاری کا شکار ہو چکی تھی، دوبارہ زندہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ افسوس ہے کہ کتاب کا اصل خطی نسخہ دستیاب نہیں ہو سکا۔ موجودہ اشاعت میں ۱۹۰۳ء کی اشاعت کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اس اشاعت میں کتابت کی متعدد غلطیاں تھیں جن کی موجودہ اشاعت کے متن میں تصحیح کر دی گئی ہے۔ البتہ ایسے مقامات پر حاشیے میں ۱۹۰۳ء کے متن کے الفاظ نقل کر دیے گئے ہیں۔

ہم جناب ڈاکٹر انور اقبال قریشی کے ممنون ہیں جنھوں نے اکادمی کی درخواست پر اس کتاب کے لیے ایک عالمانہ دیباچہ تحریر فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب کے دیباچے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اقبال کی یہ تصنیف نہ صرف اپنے زمانے کا ایک غیر معمولی کارنامہ تھی بلکہ آج بھی اس کی افادیت ایک بڑی حد تک برقرار ہے۔ جہاں تک کتاب کے علمی مباحث کا تعلق ہے، ڈاکٹر صاحب نے ان پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ میں محض کتاب کے لسانی پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔ اقبال کی اس تصنیف نے سب سے پہلے اُردو زبان میں جدید معاشیات سے متعلق الفاظ فراہم کیے جیسا کہ خود اقبال نے وضاحت کی ہے یہ کتاب اشاعت سے پہلے شبلی کی نظر سے گزری تھی اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس کے علمی الفاظ اور اصطلاحات کو شبلی کی سند حاصل ہے۔ البتہ موجودہ دور میں جو نئے الفاظ اور اصطلاحات وضع کیے گئے ہیں ان کی فہرست موجودہ اشاعت میں علیحدہ طور پر کتاب میں شامل کر دی گئی ہے۔

علم الاقتصاد میں مصنف کی جدّت فکر اور موضوع پر گرفت کے پیش نظر ڈاکٹر قریشی کی رائے ہے کہ اقبال کو معاشیات کی طرف مستقل توجہ دینی چاہیے تھی۔ یہ ایک ماہر اقتصادیات کی رائے ہے اور اس لحاظ سے قابل قدر، مگر واقع یہ ہے کہ اقتصادیات کا مطالعہ اقبال کی زندگی میں ایک ضمنی حیثیت رکھتا تھا اور اس سے زیادہ غالباً ممکن بھی نہ تھا۔ اگرچہ

اقبال کو زندگی بھر معاشیات سے دلچسپی رہی لیکن انھیں اس موضوع سے وہ تعلق پیدا نہ ہوا جو شعر، فلسفہ، سیاسیات اور قانون دانی سے تھا۔ خود اقبال نے مجھ سے بیان کیا کہ کیمرج کے زمانہ میں انھیں وقتاً فوقتاً یہ احساس ہوتا تھا کہ فلسفے میں ان کا انہماک ضرورت سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ چنانچہ اس احساس کے پیش نظر وہ کیمرج کی دانش گاہ میں گاہے گاہے اقتصادیات کے درس میں شریک ہوا کرتے تھے تاکہ اپنی شخصیت میں توازن قائم رکھ سکیں۔

نفس مضمون کے اعتبار سے مجھے اس کتاب کے دو موضوعات کا تذکرہ کرنا ہے۔ اوّل یہ کہ اقبال نے قومی تعلیم کو معاشی ترقی اور ملکی پیداوار کی افزائش کا لازمی وسیلہ قرار دیا ہے اور یہ وہ نکتہ ہے جو اکثر ماہرین اقتصادیات کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے۔ ذاتی طور پر مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تعلیم اور اقتصادی ترقی لازم وملزوم ہیں اور جب تک کسی ملک میں قومی تعلیم پورے طور پر عام نہ ہو وہ ملک کماحقہ اقتصادی ترقی نہیں کر سکتا۔

دوسرا مسئلہ جس پر اقبال نے جدّتِ فکر کا ثبوت دیا ہے آبادی اور خاندانی منصوبہ بندی کا مسئلہ ہے۔ یہ مسئلہ ہندوپاکستان کے برصغیر میں ایک مدّت تک کم و بیش ذہنی غفلت کا شکار رہا۔ حتیٰ کہ ماہرین اقتصادیات نے بھی اُس پر کوئی خاص توجہ نہیں فرمائی۔ سب سے پہلی کتاب جو اس موضوع پر لکھی گئی پی کے واتل کی مشہور تصنیف ہندوستان کی آبادی کا مسئلہ تھی۔ یہ کتاب ۱۹۱۶ء میں شائع ہوئی۔ واتل بھی اقبال کی طرح تحدید نسل اور خاندانی منصوبہ بندی کے حامی ہیں۔ اس دبستانِ خیال کی اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے مگر اس حقیقت کا اعتراف لازم ہے کہ اس برصغیر میں اس کی قیادت کا سہرا اقبال کے سر ہے اور اوّلیت انھی کو حاصل ہے۔ ان کے الفاظ غور سے پڑھنے کے قابل ہیں:

ہمارے ملک میں سامان معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وبا سے اس کا علاج کرتی ہے۔ مگر ہم کو بھی چاہیے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے۔ اور جہاں تک ممکن ہو بچوں کی

کم سے کم تعداد پیدا کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظِ دیگر شرح پیدائش کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اقبال آج سے ساٹھ سال پہلے ہمارے موجودہ معاشی مسائل کو ہم سے زیادہ اچھی طرح دیکھ اور سمجھ رہے تھے۔

اس سلسلہ میں اقبال کی وہ تحریر بھی دلچسپی سے خالی نہیں جو رسالہ الحکیم لاہور کے نومبر ۱۹۳۶ء کے شمارے میں چھپی اور جسے رسالہ ہمدردِ صحت دہلی نے جولائی ۱۹۳۹ء میں اپنے "ضبط تولید" نمبر میں نقل کیا ہے۔ اس تحریر میں اقبال نے آبادی کی افزایش اور ضبط تولید کے مسئلے پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

> شریعتِ اسلامی نے اجتماعی مسائل میں مصالح اُمت کو نظر انداز نہیں کیا اور اس کے تصفیے کو اہل علم پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ حالات و مقتضائے وقت کے مطابق ان کا فیصلہ کریں۔ اس لیے اگر حظِ نفس مقصود نہ ہو، حقیقی ضرورت موجود ہو اور فریقین رضامند ہوں تو جہاں تک میرا علم رہنمائی کرتا ہے شرعاً ضبط تولید قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ اصول شرعی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاوند اپنی بیوی کو، اگر وہ اولاد کی خواہش مند نہ ہو، اولاد پیدا کرنے پر باکراہ مجبور نہیں کر سکتا۔ لیکن دنیا میں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے اس کا بیشتر حصہ حظِ نفس پر مبنی ہے اور محض حظِ نفس کے لیے ایسا کرنا میرے نزدیک حرمت کے درجے تک پہنچتا ہے۔ شرعی پہلو سے جو میں نے رائے دی ہے وہ ماہر شریعت کی حیثیت سے نہیں دی محض اپنے علم و مطالعہ کی بنا پر دی ہے۔

معاشیات کے مسائل اقبال کی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی نہ بن سکے۔ مگر انھیں اس موضوع سے عمر بھر ایک گہری دلچسپی رہی۔ اس کی جھلک ان کی تحریر، اور تقریر دونوں میں پائی جاتی ہے۔ ۱۹۱۰ء میں انھوں نے علی گڑھ میں "ملتِ بیضا پر ایک عمرانی نظر" کے عنوان سے جو لیکچر دیا اُس میں فرمایا:

> سب سے زیادہ اہم عقدہ اس مسلمان کے سامنے جو قومی کام کے لیے اپنے آپ کو وقف کرنا چاہتا ہے، یہ ہے کہ کیونکر اپنی قوم کی اقتصادی حالت کو سدھارے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ

ہندوستان کی عام اقتصادی حالت پر نظر غائر ڈال کر ان اسباب کا پتہ لگائے جنھوں نے ملک کی یہ حالت کر دی ہے۔ اس کا یہ فرض ہے کہ کسی اور مسئلہ پر غور کرنے سے پہلے یہ دریافت کرے کہ ملک کی حالت میں کس حد تک ان بڑی بڑی اقتصادی قوتوں نے حصہ لیا ہے جو آج کل دنیا میں اپنا عمل کر رہی ہیں۔ کس حد تک اہل ملک کی تاریخی روایات، عادات، اوہام اور اخلاقی کمزوریوں نے حصہ لیا اور اگر گورنمنٹ کے طرزِ عمل کا بھی کوئی حصہ ہے تو وہ کس حد تک ہے؟ شرح مالگذاری میں آئے دن کا اضافہ، مسکرات ممالک غیر کی اس ملک میں درآمد، قیمت اجناس کی گرانی کا باعث ممکن ہے یہ ہو کہ سکہ رائج الوقت کے متعلق حکومت کے قائم کیے ہوئے اصول غلط ہیں یا یہ کہ ایک زراعتی ملک اور ایک صنعتی ملک کے درمیان آزاد تجارت کا سلسلہ قائم کر دیا گیا یا کوئی اور سبب ہو۔

دسمبر ۱۹۳۰ء والے الٰہ آباد کے خطبہ صدارت میں جہاں انھوں نے پاکستان کا تصور پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے پیش کیا، اُنھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی اور مقروضیت کا تذکرہ کیا۔ اسی طرح مارچ ۱۹۳۲ء والے لاہور کے خطبۂ صدارت میں اُنھوں نے یہ تجویز پیش کی کہ مسلمان نوجوانوں کی انجمنیں اس غرض کے لیے قائم کی جائیں کہ وہ اور باتوں کے علاوہ تجارت اور کاروبار کے میدان میں تنظیم کے لیے جدوجہد کریں اور دیہات میں مسلمان کاشتکاروں کی اقتصادی بدحالی اور مقروضیت کے ازالے کے لیے ایک تبلیغی مہم چلائیں۔

جس زمانے میں اقبال پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے انھوں نے صوبائی میزانیہ پر وقتاً فوقتاً تقریریں کیں۔ منجملہ اور تجویزوں کے اُن کی ایک تجویز یہ تھی کہ جن کاشتکاروں کی آمدنی ایک خاص حد سے کم ہو انھیں انکم ٹیکس کی طرح لگان میں رعایت دی جائے یا اس سے معافی دی جائے۔ اقبال کی اس تجویز پر پنجاب لیجسلیٹو کونسل نے توجہ نہیں فرمائی مگر آج کل یہی مسئلہ ہمارے لیے اہمیت اختیار کر چکا ہے اور پاکستان کے اندر اور باہر اقبال کے ہم خیال موجود ہیں۔

معاشی مسائل سے اقبال کی دلچسپی ان کی شاعری میں بھی جا بجا جھلکتی ہے۔ ''خضرِ راہ'' میں شاعر جناب خضر سے سوال کرتا ہے:

زندگی کا راز کیا ہے؟ سلطنت کیا چیز ہے؟
اور یہ سرمایہ و محنت میں ہے کیسا خروش؟

خضر کا جواب نظم کے ایک بند میں ہے۔ یہ جواب ''بندۂ مزدور'' کے نام ایک پیغام ہے:

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہلِ ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰت
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات
اُٹھ کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

بالِ جبریل میں لینن خدا کے حضور عرض گزار ہے:

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات
ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جُوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات
بیکاری و عُریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ؟
دنیا ہے تری منتظر روزِ مکافات

ضربِ کلیم میں کارل مارکس کی زبان سے مغربی معاشیین کو مخاطب کیا گیا ہے:

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش مریز و کجدار کی نمائش

جاوید نامہ میں جمال الدین افغانی ملّت روسیہ کو پیغام دیتے ہوئے سود کے متعلق فرماتے ہیں:

از ربا دانی چہ می زاید؟ فتن
کس نداند لذت قرض حسن!
از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ
رزق خود را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

اس سے آگے بڑھیے تو خود خدا کا پیغام ہے فرشتوں کے نام:

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

البتہ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ اگرچہ سرمایہ دار اور مزدور کی جنگ میں اقبال مزدور کے حامی ہیں اور لینن اور کارل مارکس کی زبان سے انھوں نے بہت کچھ کہا اور کہلوایا ہے، مگر وہ روسی اشتراکیت کو، جو مساواتِ شکم سے زیادہ نہیں، لادینیت اور منفیت کا مظاہرہ سمجھتے ہیں:

روس را قلب و جگر گردید خوں
از ضمیرش حرف لا آمد بروں

کردہ ام اندر مقاماتش نگاہ
لا سلاطیں، لا کلیسا، لا الٰہ
فکر او در تند باد الّا بماند
مرکب خود را سوئے الا نراند
در مقامِ لا نیاساید حیات
سوئے الّا می خرامد کائنات

ضربِ کلیم میں مغربی تہذیب کے دو اہم پہلوؤں پر ایک شعر میں کڑی تنقید کی ہے:

کیا یہی ہے معاشرت کا کمال
مرد بیکار، زن تہی آغوش

مجھے اقبال کے معاشی نظریات سے بحث مطلوب نہیں ہے۔ وہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ میرا مقصد فی الحال محض اس دل بستگی کو واضح کرنا تھا جو اقبال کو زندگی بھر معاشی مسائل سے رہی۔ ضرورت اس کی ہے کہ اقبال کے معاشی تصورات اور نظریات کا تفصیلی جائزہ لیا جائے۔ اس کے لیے مناسب ہو گا کہ معاشی موضوعات پر اقبال کے اقوال یک جا کر دیے جائیں اور ان پر ایک مجموعی نظر ڈالی جائے۔

اقبال کو اواخر عمر میں مسلمانوں کے افلاس اور اقتصادی زبوں حالی کا کس قدر شدید احساس تھا۔ اس کا اندازہ کرنا ہو تو اس خط و کتابت کی طرف رجوع کرنا چاہیے جو اقبال اور جناح کے مابین ہوئی۔ اقبال، جناح کو ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھتے ہیں:

روٹی کا مسئلہ دن بدن زیادہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو یہ احساس ہو رہا ہے کہ پچھلے دو سو سال سے ان کی معاشی حالت برابر گرتی جا رہی ہے۔ عام طور پر ان کا یہ خیال ہے کہ ان کا افلاس ہندو سود خواروں اور سرمایہ داروں کی بدولت ہے۔ ابھی انھیں یہ محسوس نہیں ہوا کہ ان کے افلاس میں بیرونی استعمار کا بھی برابر کا دخل ہے مگر یہ احساس پیدا ہو کر رہے گا۔

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے افلاس اور ناداری کے مسئلے کا کیا حل نکالا جائے۔ مسلم لیگ کے مستقبل کا انحصار تمام تر اسی پر ہے کہ وہ اس مسئلے کا کیا حل پیش کرتی ہے۔

علم الاقتصاد اور معاشیات پر اقبال کی مختلف تحریروں اور تقریروں کے پیش نظر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں کی جنگ آزادی میں حصہ لینے والے رہنماؤں میں قوم کی اقتصادی مشکلات کا جو احساس اور شعور اقبال کو تھا وہ کسی اور کو نہ تھا۔

موجودہ نسخے کے متن کی تصحیح مجلّہ اقبال ریویو کے مدیر معاون جناب خورشید احمد صاحب کی کوششوں کی مرہونِ منت ہے۔ اُنھوں نے متن پر حواشی بھی لکھے ہیں اور کتابت کی غلطیوں کو بھی درست کر دیا ہے لیکن ان پر کوئی نوٹ نہیں دیا۔ عام اغلاط کو درست کر دیا گیا ہے اور حاشیہ میں نوٹ دے دیا ہے۔ انگریزی اصطلاحات حاشیے میں دی گئی ہیں۔ جہاں کسی لفظ یا اصطلاح کی توضیح ضروری تھی وہاں حاشیے میں تشریح کر دی گئی ہے۔

جہاں اصل نسخے میں اقبال کے لکھے ہوئے حواشی موجود ہیں، انھیں برقرار رکھا گیا ہے اور اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے۔ خورشید صاحب نے موجودہ متن کا موازنہ انجمن ترقی اُردو کے کتب خانہ خاص کے نسخے سے بھی کیا ہے اور جہاں جہاں فوٹو کے الفاظ صاف نہ تھے ان کو درست کر دیا ہے۔ اُنھوں نے اصطلاحات کی ایک فرہنگ بھی تیار کی ہے جو کتاب کے آخر میں ضمیمے کے طور پر شامل ہے۔

کراچی۔ ۱۰ جون ۱۹۶۱ء — ممتاز حسن

مقدمہ

یہ امر میرے لیے انتہائی باعث مسرت اور موجب افتخار ہے کہ میں اقبال اکادمی کراچی کے توسط سے ایک متاع گم گشتہ کی بازیافت میں مدد دے رہا ہوں۔ اقبال کی زیر نظر تصنیف دنیا کے ادبی شاہکاروں کی طرح شراب کہن کی مانند ہے جس کی ارزش اور پر مائگی میں وقت کے گزرنے کے ساتھ کمی نہیں بلکہ اضافہ ہوتا ہے۔ اقبال کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور مختلف علمی اور تخلیقی میدانوں میں دنیا ان کی خداداد قابلیت اور ذہانت کو خراجِ عقیدت پیش کر چکی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ اقبال کی پہلی تصنیف کا تعلق نہ شاعری سے ہے نہ فلسفے سے، بلکہ ان کی علمی کوششوں کا پہلا ثمر ۱۹۰۳ء میں علم الاقتصاد کے نام سے ۲۱۶ صفحات پر مشتمل کتاب کی صورت میں لاہور سے شائع ہوا۔ جس میں معاشیات کے اہم مسائل کو نہایت واضح اور مؤثر طریق سے سلجھایا گیا ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ کرنے سے پہلے چند حقائق بطور پس منظر بیان کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ ان حقائق کی روشنی میں اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کے سمجھنے میں ضروری مدد ملتی ہے۔

اقبال نے ۱۸۹۷ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی، فلسفہ اور عربی کے مضامین لے کر بی اے کی سند حاصل کی تھی۔ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے ایم اے کی ڈگری فلسفہ کے مضمون میں حاصل کی اور اس کے بعد وہ گورنمنٹ کالج میں اسی مضمون کے لیکچرار مقرر ہوئے ۱۹۰۵ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔

علم الاقتصاد یورپ جانے سے دو برس پیشتر اور ایم اے فلسفہ کے چار سال بعد شائع ہوئی۔ کتاب پر جیسا کہ ہندوستانی اور پاکستانی کتابوں میں اکثر ہوتا ہے۔ اس کی تاریخ اشاعت درج نہیں ہے۔

کتاب پڑھنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوا کہ اقبال نے اپنی کیمبرج کی تعلیم کے دوران معاشیات پر پروفیسر مارشل کے لیکچر ضرور سنے ہوں گے کیونکہ اس زمانہ میں مارشل کا کیمبرج میں بہت شہرہ تھا اور یہ کتاب ان لیکچروں سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہو گی۔ کتاب کو زیادہ غور سے پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں پروفیسر ٹاؤسگ کا اثر زیادہ نمایاں ہے۔ آج سے بیس پچیس برس پیشتر ٹاؤسگ کی کتاب بہت رائج تھی کیونکہ مارشل کے مقابلے میں یہ زیادہ آسان ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ٹاؤسگ کی کتاب دو جلدوں میں پہلی مرتبہ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی۔

میری حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب مجھے یہ پتہ چلا کہ علم الاقتصاد ۱۹۰۳ء میں شائع ہوئی تھی اور اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان گئے۔ اس وقت تک تو ٹاؤسگ کی کتاب شائع ہی نہیں ہوئی تھی اور مارشل کے لیکچروں سے متاثر ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اقبال نے معاشیات کی کوئی باقاعدہ تعلیم بھی حاصل نہیں کی تھی۔ اگر اس وقت انھوں نے کالج میں اس مضمون میں تعلیم حاصل کی بھی ہوتی تو اس سے چنداں فائدہ پہنچنے کی صورت نہ تھی۔ کیونکہ پہلی جنگ عظیم سے قبل نہ تو اس مضمون پر زیادہ کتابیں تھیں اور نہ ہی اس کا معیارِ تعلیم، کم سے کم پنجاب کے کالجوں کی حد تک، چنداں تسلی بخش تھا۔ یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۳ء میں اُردو میں تو کیا انگریزی میں بھی معاشیات پر کسی ہندوستانی کی لکھی ہوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے اُردو میں معاشیات پر پہلی تصنیف الیاس برنی مرحوم کی کتاب علم المعیشت ہے جسے ۱۹۱۶ء میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا۔ اسی زمانے میں حیدرآباد میں دارالترجمہ قائم ہوا۔ اُردو میں علمی اصطلاحات وضع ہونے لگیں اور جامعہ عثمانیہ کے قیام سے اُردو میں معاشیات پر بھی مطبوعات کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان حالات میں کیا بلحاظ زبان اور کیا بلحاظ اصطلاحات اور نفس مضمون علم الاقتصاد ایک خاص مقام رکھتی ہے۔

میرے ایک محترم دوست نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد آپ کی رائے میں یہ کتاب موجودہ دور میں کیا اہمیت رکھتی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ یہ مقابلہ

ایسا ہی ہے جیسا کہ ۱۹۳۰ء کے ڈکوٹا ہوائی جہاز کا ۱۹۶۰ء کے بوئنگ جہاز سے کیا جائے۔ ۱۹۳۰ء میں بوئنگ جہاز کا تصور بھی موجود نہ تھا اور اس وقت عام رائج الوقت سواریوں کے مقابلے میں لوگ ڈکوٹا سے زیادہ مرعوب تھے اور یہ اس وقت اتنا ہی زیادہ تیز رفتار تھا جتنا ۱۹۶۰ء میں مسدود سواریوں کے مقابلے میں بوئنگ جہاز ہے۔ بایں امر ڈکوٹا آج بھی ایک مقام رکھتا ہے۔ بالخصوص ان علاقوں میں جہاں فاصلے کم اور ہوائی اڈے معمولی درجہ کے ہیں۔ یہی کیفیت زیر تبصرہ کتاب کی ہے۔ اس زمانے کے لحاظ سے یہ ایک نہایت قابلِ قدر علمی کارنامہ تھا اور اس وقت علم المعیشت کی تعلیم انگریزی زبان میں بھی بہت معمولی درجہ رکھتی تھی اور اس مضمون کے جاننے والوں کی تعداد نہایت محدود تھی۔ اُردو میں ایک ایسی کتاب لکھنا جو اس مشکل مضمون کو عام فہم الفاظ میں بیان کرکے عوام کے لیے ایک نیا علمی ذخیرہ مہیا کردے، ایک انتہائی قابل قدر کوشش تھی۔ جس کی اہمیت اور افادیت آج بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میری رائے تو یہ ہے کہ اقبال نے اپنے معاشیات کے شوق کو ترک کرکے قوم پر ایک گونہ ظلم کیا ہے۔ اگر وہ معاشیات سے بھی اپنی دلچسپی برقرار رکھتے تو مسلمانوں میں ممتاز ماہرین معاشیات کا وہ فقدان نہ ہوتا، جو آج رونما ہے۔

علم الاقتصاد اگرچہ ایک ابتدائی کتاب ہے اور اقبال کی جواں سالی کی علمی کوششوں کا پہلا ثمر ہے لیکن جہاں جہاں اقبال نے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ اپنے زمانے کی معاشی صورت حال پر اپنی طرف سے تنقید کی ہے، اُس سے ان کی خداداد قابلیت کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں اور ان کی نظر کی وسعت، رائے کی پختگی اور عالی دماغی کا پتہ چلتا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا فلسفے اور نفسیات کا مطالعہ ان کے معاشیات کے میدان میں بھی کام آتا ہے۔

چنانچہ ماہرین علم الاقتصاد کے فرائض بیان کرتے ہوئے وہ دو ایسے امور کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن پر اس علم کے ماہرین نے آج تک پوری توجہ نہیں دی اور یہی وجہ ہے کہ عملی نتائج خاطر خواہ نہیں نکلے۔ اس سلسلے میں وہ ماہرین اقتصادیات کی توجہ مندرجہ ذیل فرائض کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں:

۱- انسان کی دماغی بناوٹ کے بعض ضروری واقعات کا معلوم کرنا، جن کا تعلق انسانی فطرت کے ساتھ ہے۔

۲- دیگر اسباب کا تحقیق کرنا جو انسانی افعال پر اثر کرتے ہیں جن کا مقصود حصول دولت ہو۔ مثلاً ملّی اور تمدّنی رسوم، جدید ضروریات کا پیدا ہونا یا قوانین متعلقہ زمین وغیرہ۔

وہ لکھتے ہیں:

مگر ہماری رائے میں دونوں فریق راستی پر ہیں۔ علم الاقتصاد کے لیے ضروری ہے کہ اوّل چند خاص اصول بطور بناء کے قائم کیے جائیں اور پھر یہ معلوم کیا جائے کہ انسانی زندگی کے موجودہ حالات و واقعات سے ان ابتدائی اصولوں میں عملاً کیا تغیر پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال علاوہ اور باتوں کے ماہرین علم الاقتصاد کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے علم کی بنیاد انسانی فطرت کے صحیح اصولوں پر قائم کریں۔ ورنہ اُن کو صحیح اور کلی نتائج کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ فرضاً اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان بالطبع خودغرض ہے یا اس کی فطرت قدر تاً وصفِ امتیاز سے کلی طور پر مبّرا ہے اور اس ابتدائی اصول کو اقتصادی استدلال کی بنیاد قرار دیا جائے تو ظاہر ہے تمام استدلالات جو اس اصول پر مبنی سمجھے جائیں گے غلط ہوں گے۔ کیونکہ حقیقتاً انسانی فطرت اس قسم کی نہیں ہے۔ بلکہ خودغرضی اور ایثار دونوں سے مرکب ہے۔ اگر کسی قوم میں علم الاقتصاد کے ایسے اصول مروج ہو جائیں جو اس قسم کے غلط مشاہدے پر مبنی ہوں تو وہ قوم ایک دو صدیوں کے عرصے میں ہی ایک حیرت ناک تنزل کرے گی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس قوم کے ہر فعل میں بے جا خودغرضی اور زرپرستی کی بُو آئے گی، جو اس کو کسی نہ کسی دن حضیض ذلّت میں گرا کر چھوڑے گی۔

اقبال نے جہاں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اس کی پختگی اور صحت سے کسی صائب الرائے کو انکار نہیں ہو سکتا۔ شروع صدی میں جب اس ملک میں معاشیات کی تعلیم کا رواج ہوا تو اکثر و بیشتر ہندوستانی علماء نے ہندوستان کے معاشی مسائل کو عام معاشی مسائل سے مختلف قرار دیتے ہوئے معاشیات ہند کو ایک جداگانہ علم کی حیثیت قرار دینے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں اقبال لکھتے ہیں:

ایک مصنف نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے، جس کو اُس نے اقتصاد ہندی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ غلطی علم کو فن سے متمیز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علم کا کام صرف واقعات کے علل و اسباب معلوم کرنا ہے۔ یہ کسی طریق عمل پر مستحسن یا مذموم ہونے کا حکم نہیں لگاتا۔ برخلاف فن کے جس کا فرض منصبی خاص واقعات کو ملحوظ رکھ کے کسی مقصد کے حصول کے لیے خاص خاص قواعد اور طریق عمل پیش کرنا ہے۔ ہماری رائے میں علم الاقتصاد کا یہ کام نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے لیے کوئی خاص طریق عمل پیش کرے یا کسی طریق پر حکم لگائے۔ لہٰذا ہم اس کو دیگر نظری علوم کی طرح ایک علم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنے میں ہمیں عذر نہیں ہے کہ اس سے کلیہ اصولوں میں جدید واقعات کے لحاظ سے ایسا تغیر آنا ممکن ہے جس سے ان کی وسعت زیادہ ہو جائے اور ان کو نئے نئے واقعات پر حاوی کر دے۔

راقم الحروف کی رائے میں اگر ہندوستانی اور پاکستانی ماہرین معاشیات اس رمز کو شروع ہی سے سمجھنے کی کوشش کرتے (بعض تو اب تک بھی اسے نہیں سمجھے) تو ملک میں معاشی مسائل کا علم اس قدر پست اور پسماندہ نہ رہتا۔

علم الاقتصاد کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال نے اس مضمون کا مطالعہ کرنے میں خاصی عرق ریزی سے کام لیا تھا اور اس میں اس قدر دسترس حاصل کر لی تھی کہ وہ رائج الوقت نظریوں پر ناقدانہ نگاہ ڈال سکیں۔ مثلاً اس وقت کی مروجہ کتابوں میں اجرتوں کے متعلق یہ نظریہ تھا کہ اُجرتیں ایک مخصوص ذخیرہ سے ادا کی جاتی ہیں۔ اور اگر اُجرتیں بڑھا دی جائیں تو یہ ذخیرہ کم ہو جائے گا جس سے بالآخر مزدور متاثر ہوں گے۔ بیسویں صدی کے آغاز ہی میں اس نظریہ پر تنقید شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ اقبال نے اپنی کتاب کے صفحہ ۸۹ پر اس نظریہ کے خلاف امریکہ کے مشہور مصنف واکر کے دلائل پیش کیے ہیں جس سے ان کی وسعتِ نظر اور گہرے مطالعہ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ غالباً اس قسم کی تحریریں پڑھنے کا نتیجہ تھا جس نے بعد میں یہ شعری صورت اختیار کی:

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

جوانی میں بھی اقبال کی نظر وسیع تھی اور وہ بنیادی مسائل پر زور دیتے تھے۔ مزدوروں کی بہتری وخوش حالی اور قومی ترقی کے سلسلے میں ان سطور پر غور فرمایے:

مگر ہمارے نزدیک کمی اُجرت کا مفید ترین نسخہ قومی تعلیم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے دستکار کا ہنر، اس کی محنت کی کارکردگی اور اس کی ذہانت ترقی کرتی ہے، اس کے اخلاق سنورتے ہیں اور وہ اس قابل بنتا ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ تعلیم کی مدد سے دستکار اپنے کام کو سہولت کے ساتھ کر لینے کی راہیں سوچ سکتا ہے اور جدید کلوں کا استعمال جلد سیکھ سکتا ہے۔ اور شراب خوری اور ہر قسم کی غلط کاری سے محفوظ رہتا ہے، جو بالعموم جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

آبادی کا مسئلہ آج کل دنیا کی مختلف حکومتوں اور ماہرین معاشیات کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ ۱۹۰۱ء میں جب کہ ہندوستان کی آبادی صرف ۲۹ کروڑ ۴۰ لاکھ تھی اور آبادی کا مسئلہ کچھ ایسا تشویش ناک نہ تھا۔ وہ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اکثر قدیم قومیں ایک سے زیادہ بیویاں کرنا مستحسن تصور کرتی تھیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی ہے اور کچھ یہ کہ ہر قبیلہ اپنے افراد کی تعداد کو زیادہ کرنا چاہتا تھا کہ اس سے جنگ وجدل میں جو تمدن کے ابتدائی مراحل کا خاصہ ہوتا ہے دیگر قبائل پر غلبہ رہے۔ تاہم یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقتصادی لحاظ سے تعدد ازدواج تمدن کی ہر صورت میں مستحسن ہے۔ کیونکہ اس سے آبادی بہت بڑھتی ہے جو بسا اوقات قوموں کے افلاس کا باعث ہوتی ہے۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

تمدن کے ابتدائی مراحل میں انسانی ضروریات بہت محدود تھیں مگر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جہاں پہلے صرف خوراک کی خواہش تھی جب یہ پوری ہوئی تو انسان کو مکانوں کو آراستگی اور ان کے نقش ونگار کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ ہر جدید خواہش یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی اور خواہش کو دبائے رکھے اور اس کو پورا کرے۔ لہٰذا انسان اپنی جدید خواہشوں کے پورا کرنے کی دھن میں اپنی پہلی ضروریات کو محدود کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بالعموم اپنی قوتِ تولد وتناسل کو بھی کفایت شعاری سے برتنے لگتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے

بیٹوں کی شادی نہیں کرتے جب تک کہ وہ تعلیم سے فارغ نہ ہولیں۔ بیٹے کی تعلیم کو اس کی شادی پر مقدم سمجھتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات اس خیال کا محرّک یہی امر ہوتا ہے کہ بیٹے کی شادی ہوگئی تو اولاد پیدا ہونی شروع ہو جائے گی اور بیٹے کو اپنے بچوں کی پرورش کے خیال سے تعلیم کو خیر باد کہنا پڑے گا۔ صاف ظاہر ہے کہ شادی کو اسی طرح معرض التوا میں ڈالنا گویا اولاد کی تعداد کو کم کرنا ہے۔ جو بصورت دیگر ایام کتخدائی میں پیدا ہونی ممکن تھی۔ علاوہ بریں تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ انسان کو مختلف اقسام کی خورد نوش اور طرح طرح کے اسبابِ تن آسانی کی بھی خواہش ہوتی ہے جو اُسے محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اس کی قوتِ تناسل و توالد پر وہ زبردست اثر کرتی ہے کہ مفلسی کا خوف بھی وہ اثر نہیں کرسکتا۔ کیونکہ امیرانہ ٹھاٹھ سے گزارا کرنا انسان کی ایک جبلی خواہش ہے اور بسا اوقات یہ خواہش اس کو اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکتی ہے۔ علی ہذا القیاس بعض ممالک میں جہاں کی زمین بالعموم چھوٹے چھوٹے مالکان خود کاشت میں منقسم ہے زمیندار زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس قدر اولاد کی تعداد زیادہ ہوگی اسی قدر ان کی جائیداد زیادہ حصوں میں منقسم ہوگی اور اگر ان کی اولاد کے ہاں بھی اولاد پیدا ہونی شروع ہوگئی تو حصہ زمین کی وہ قلیل مقدار ان کے گزارے کے لیے کسی طرح کافی نہ ہوگی۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ افزایش آبادی کو روکنے کی خواہش زیادہ زور کے ساتھ اسی صورت میں عمل کرتی ہے جب کہ زمین کی کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ گئی ہو۔ یا بالفاظِ دیگر جب انسان کو یہ خیال ہو کہ سامانِ معیشت کی مقدار کافی طور پر مہیا نہ ہوسکے گی۔ اس اصول کی رو سے تم خود اندازہ کرسکتے ہو کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں سامانِ معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وبا سے اس کا علاج کرتی ہے مگر ہم کو بھی چاہیے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ اپنے قلیل سرمائے کو زیادہ دُور اندیشی سے صرف کریں صنعت و حرفت کی طرف توجہ کرکے ملک کی شرح اُجرت کو زیادہ کریں اور عاقبت بینی کی راہ سے اپنی قوم کے انجام کی فکر کریں تاکہ ہمارا ملک مفلسی کے خوفناک نتائج سے محفوظ ہوکر تہذیب و تمدن کے ان اعلیٰ مدارج تک رسائی حاصل کرے جن کے ساتھ ہماری حقیقی بہبودی وابستہ

ہے۔ ان سطور سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم بنی آدم کو کلی طور پر شادی وغیرہ کی لذّت اٹھانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچوں کی کم سے کم مقدار پیدا ہو اور بیوی کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے اور اس کو بالکل دبائے رکھنا بھی صحت کے خلاف ہے۔ لہٰذا اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے اور جہاں تک ممکن ہو بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظِ دیگر شرح پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

یہ چند نمونے میں نے صرف اس بات کی وضاحت کے لیے پیش کیے ہیں کہ اہم معاشی مسائل کے متعلق اقبال کی رائے کس قدر صائب تھی اور وہ مسائل جو آج ملک کے لیے پریشانی کا باعث بنے ہوئے ہیں، اقبال نے ساٹھ سال پہلے ان پر کس خوبی سے روشنی ڈالی تھی۔

اس مختصر مقدمہ میں زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔ میری رائے میں اقبال اکادمی نے اس کتاب کو شائع کر کے اقبال کے ایک ایسے پہلو کو نمایاں کیا ہے جو پہلے عوام کے سامنے نہ تھا۔ کتاب کی اشاعت موجودہ دور میں بھی معاشیات کے ابتدائی طالب علموں اور ان پڑھے لکھے لوگوں کے لیے جو اس مضمون سے متعارف ہونا چاہتے ہیں نہایت مفید ہے۔

۲-اے، کوئینز روڈ، کراچی انور اقبال قریشی
۲۶/اپریل ۱۹۶۱ء

پیش کش

اس دلی ارادت کے سبب جو مختصر سے زمانۂ تلمذ میں مجھے عالی جناب ڈبلیو بل اسکوئر ڈائریکٹر محکمہ تعلیم پنجاب کی خدمت میں پیدا ہوئی جب وہ گورنمنٹ کالج لاہور کی کرسی صدارت پر رونق افروز تھے اور اس عالم گیر شہرت کے باعث جو صاحب ممدوح کو بحیثیت مربی علوم وفنون حاصل ہے۔ میں اس ناچیز کتاب کو جو میری علمی کوششوں کا پہلا ثمر ہے صاحب موصوف کے نام نامی سے منسوب کرنا چاہتا ہوں اور اس امید پر کہ یہ ہدیہ محقر شرف قبول پائے گا۔ نہایت ادب سے اسے پیش کش کرتا ہوں۔

مصنف

دیباچۂ مصنف

علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اُس کا مقصد اس امر کا تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اعتبار سے تو اُس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج، اس کے اوضاع واطوار اور اس کے طرزِ زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے بلکہ اُس کے دماغی قویٰ بھی اس اثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخ انسانی کے سیل رواں میں اصول مذہب بھی انتہا درجہ کا مؤثر ثابت ہوا ہے۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت انسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اس کے ظاہری اور باطنی قویٰ کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود وعدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اوّل یعنی حکیم ارسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدن انسانی کے قیام کے لیے ایک ضروری جزو ہے مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوتِ مدارج بجائے اس کے کہ قیام تمدن کے لیے ایک ضروری جزو ہو، اس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اس طرح اس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ہے کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کی دل

خراش صدائیں ہمیشہ کے لیے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے افلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لیے صفحۂ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹ جائے؟ اس سوال کا شافی جواب دینا علم الاقتصاد کا کام نہیں کیونکہ کسی حد تک اس کے جواب کا انحصار انسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے جن کو معلوم کرنے کے لیے اس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے مگر چونکہ اس جواب کا انحصار زیادہ تر اُن واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں اس واسطے یہ علم انسان کے لیے انتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے اور اس کا مطالعہ قریباً قریباً ضروریات زندگی میں سے ہے۔ بالخصوص اہل ہندوستان کے لیے تو اس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے۔ ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز ان تمدنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے جن کا جاننا قومی فلاح اور بہبودی کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ انسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنے تمدنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں اُن کا حشر کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں مہاراجہ بڑودہ نے اپنی ایک گراں بہا تقریر میں فرمایا تھا کہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے اور اگر یہ نسخہ استعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے۔ پس اگر اہل ہندوستان دفتر اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہوں تو ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں۔ میری غرض ان اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کروں اور نیز بعض بعض جگہ اس بات پر بھی بحث کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فردِ واحد کو بھی ان معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہو گئی تو میں سمجھوں گا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی۔

اس دیباچے میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اس کے مضامین مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ

کیے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ مگر صرف اسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔ زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہو گا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کے حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئ علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کی دقت کو ہر با مذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانۂ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورہ کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ مثلاً سرمایہ، سرمایہ داروں کے معنوں میں یا محنت محنتیوں کے معنوں میں۔ اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہو گا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جس کو با مذاق لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں۔ جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورۂ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

اصطلاحات کی نسبت ایک اور عرض یہ ہے کہ میں نے مانگ اور طلب و دستکاری اور محنت، دستکار اور محنتی، نفع اور منافع، ساہوکار اور سرمایہ دار، مالک و کارخانہ دار مرادف استعمال کیے ہیں۔ پیدائش اور پیداوار کا استعمال ایک باریک فرق کو ظاہر کرتا ہے یعنی پیدائش سے مراد فعل کی ہے اور پیداوار سے مراد نتیجہ فعل کی۔ علیٰ ہذا القیاس لفظِ تبادلہ اس جگہ استعمال کیا ہے جہاں مبادلۂ اشیاء زرِ نقد کے وساطت سے کیا جائے اور لفظِ مبادلہ اُس موقع پر استعمال کیا ہے جہاں ایک شے دوسری شے کے عوض میں دی جائے۔ عربی زبان میں مبادلے کا یہ مفہوم لفظ مقائفہ سے ظاہر کیا جاتا ہے، مگر چونکہ یہ لفظ عام فہم نہیں ہے، اس واسطے میں نے اس کے استعمال سے احتراز کیا ہے۔

اس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں استاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب

پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور جن کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ میں استاذی جناب قبلہ لالہ جیارام صاحب ایم اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین بی اے کینٹب بیرسٹر ایٹ لا کا بھی مشکور ہوں جنہوں نے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنایت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورات بھی دیے۔ اس کے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولانا شبلی نعمانی مدّ ظلہ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اصلاح دی۔

محمد اقبال

حصّہ اوّل

علم الاقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریقِ تحقیق

علم الاقتصاد علم انسانی کے اس خاص حصّے کا نام ہے جس کا موضوع دولت ہے اور جس کا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ دولت کی پیدائش، تقسیم، تبادلے اور استعمال کے اصول واسباب و طریق کیا کیا ہیں۔ لہٰذا اس علم کے طالب کا یہ فرض ہے کہ اپنی تحقیق و تدقیق کو دیگر علوم کی تحقیق سے مخلوط نہ کرے۔ کیونکہ کسی علم کی ترقی اس امر پر منحصر ہے کہ اسے دیگر علوم کے سلسلہ سے منفرد سمجھ کر مطالعہ کیا جائے۔ بعض حکماء کی یہ رائے ہے کہ علم الاقتصاد وسیع علم تمدن کا ایک جزو ہے اور چونکہ تمدنی زندگی کی عام صورتیں ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اس واسطے ان میں سے کسی ایک کا منفرد مطالعہ کرنا کچھ نتیجہ خیز نہ ہوگا۔ مگر یہ رائے قرین صواب نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ انسانی افعال کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ علمی نظر کامل طور سے اس کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے کسی علم کے علم بننے کے لیے اس کی تخصیص ضروری ہے۔

کیا علم الاقتصاد کا مطالعہ دولت کی محبت پیدا کرتا ہے؟ بعض لوگ اس بات پر مصر ہیں کہ اس علم کا مطالعہ اخلاقی لحاظ سے مفید نہیں ہے کیونکہ اس سے دولت کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ جو انسان کو تمام اخلاقی نیکیوں کے ناقابل کر دیتی ہے اور اسے ایک سنگ دل دنیادار بنا دیتی ہے۔ اس لغو اعتراض کے جواب میں اول تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ انسان کی غرض صرف دولت ہی نہیں ہے تاہم یہ بڑی ضروری اغراض میں سے تو ہے۔ اور اس وجہ سے لازم ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جاوے۔ اور اس کی پیدائش و تقسیم وغیرہ کے اسباب و طریق معلوم کیے جائیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سرے سے یہ اعتراض ہی صحیح نہیں ہے۔ علم الاقتصاد کے مطالعہ سے دولت کی محبت نہیں پیدا ہوتی۔ کیونکہ اس کا مقصد تو صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ حصول دولت کی خواہش جیسا کہ انسانی فطرت میں موجود ہے، انسانی افعال

پر کس طرح اثر کرتی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض میلان طبائع ایسے قوی ہوں کہ حصول دولت کی خواہش کو دبائے رکھیں۔ مگر علم اقتصاد کو ان سے تعلق نہیں ہے۔ اس کا کام یہ نہیں ہے کہ انسان کے چال چلن پر رائے زنی کرے یا یہ فیصلہ کرے کہ کون کون سے محرکاتِ افعال اخلاقی لحاظ سے اچھے ہیں اور کون کون سے بُرے۔ یہ علم انسانی افعال کے وسیع دائرہ کے صرف اس حصہ پر غور کرتا ہے جس کا تعلق حصول دولت سے ہے۔ مزید بر آں اگر غور کیا جاوے تو معلوم ہو گا کہ علم اقتصاد حرص کی تعلیم نہیں دیتا۔ بلکہ حصول دولت کے صحیح اور مسلّم اصولوں پر روشنی ڈالنے سے انسان کو یہ سکھاتا ہے کہ اس قوی خواہش کو ان اصولوں کے تحت میں رکھے اور جنگ و جدل لوٹ مار وغیرہ سے جو اس زبردست خواہش کا ضروری نتیجہ ہوا کرتے ہیں، احتراز کر کے امن و صلح کاری کے ساتھ زندگی بسر کرے۔

ہم نے لفظ ''دولت'' کئی جگہ استعمال کیا ہے۔ مگر ابھی تک یہ بیان نہیں کیا کہ اس کی ماہیت اور تعریف کیا ہے۔ دولت میں یہ ممکن الحصول اشیاء شامل ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی ضروریات کو پورا کریں اور جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے۔ مگر ظاہر ہے کہ ہر ممکن الحصول شے جس کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جائے دولت نہیں ہے۔ مثلاً ہر شخص یہ خواہش کرتا ہے کہ اُس کے دوست اُس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کریں مگر یہ محبت دولت نہیں ہے۔ پس اجزائے دولت کو معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ پہلے اشیاءِ مطلوب کو معلوم کیا جائے۔ مطلوب یا وہ تمام اشیاء جن کی ہر انسان جائز اور مناسب طور پر خواہش کر سکتا ہے، دو قسم کی ہوتی ہیں۔

۱- وہ ممکن الحصول اشیاء مادی جن میں تمام مفید اشیاء اور ان کے حقوقِ استعمال شامل ہیں۔ مثلاً زمین، پانی، آب و ہوا، زرعی پیداوار، معدنی پیداوار، مصنوعات، تعمیرات، کلیں، اوزار، رہن نامجات، پٹے وغیرہ۔

۲- اشیاءِ ممکن الحصول غیر مادّی یا ذاتی۔ اس ضمن میں دو قسم کی اشیاء شامل ہیں۔

اوّل تو وہ فوائد جو انسان اوروں سے حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مثلاً حق خدمتِ ملازمین۔

دوئم اس کے ذاتی اوصاف یا قابلیتیں جن کی وجہ سے وہ اپنے کاموں کو سر انجام کرتا ہے۔ مقدم الذکر کو اشیاء غیر مادّی خارجی کہتے ہیں اور مؤخر الذکر کو اشیاء غیر مادّی اندرونی۔ اس کے علاوہ اشیاءِ مطلوب قابل انتقال ہوتی ہیں یا نا قابل انتقال۔ مثلاً انسان کے ذاتی اوصاف یا فطری قویٰ یعنی اشیاءِ غیر مادّی اندرونی، روشنی، ہوا یا وہ حقوق جو اس کو بحیثیت ایک خاص ملک کا باشندہ ہونے کے حاصل ہیں۔ اشیاءِ مطلوب کی تقسیم اور طرح سے بھی ہو سکتی ہے یعنی اشیاء آزاد اور اشیاء قابل تبادلہ۔ اشیاء آزاد سے مراد ان اشیاء کی ہے جو نظام قدرت خود بخود مہیا کرتا ہے اور انسان کو ان کے حاصل کرنے کے واسطے کوشش نہیں کرنی پڑتی۔

اشیاء قابل تبادلہ میں وہ تمام اشیاء قابل انتقال شامل ہیں جن کی مقدار محدود ہو مگر یہ امتیاز عملی لحاظ سے کچھ بڑی وقعت نہیں رکھتا۔

اب اصطلاح ''دولت'' کا مفہوم بالصراحت واضح ہو جائے گا۔ جب ہم کسی شخص کی نسبت لفظ دولت کا اطلاق کرتے ہیں تو اس کے معنوں میں دو قسم کی اشیاء مطلوب شامل سمجھی جاتی ہیں۔

اوّل وہ ممکن الحصول اشیاء مادّی و خارجی جن پر اس کو قانوناً یا رواجاً حقِ ملکیت حاصل ہے اور جو اس وجہ سے قابل انتقال اور قابل تبادلہ ہیں۔

دوم وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادّی و خارجی جو اس کی ملکیت میں ہوں اور جن کی وساطت سے اشیاء مادّی حاصل کی جا سکیں۔ مثلاً کسی شخص کے تجارتی تعلقات وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ ''دولت'' کے مندرجہ بالا مفہوم میں انسان کے فطری قویٰ شامل نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ یہ اس کی ذات سے خارج نہیں ہیں بلکہ اس کی ذات میں داخل ہیں۔ یا یوں کہو کہ یہ اشیاء غیر مادّی اندرونی ہیں۔ جو محاورہ متعارف کے رو سے دولت میں شامل نہیں۔ پس دولت کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ وہ اُن اشیاءِ مطلوبہ میں داخل ہو جو ممکن الحصول ہوں اور جن کی خواہش انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے خیال سے جائز اور مناسب طور پر کی جا سکے۔ مگر ظاہر ہے کہ بعض اشیاء ہماری ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ مگر دولت نہیں کہلا سکتیں۔ مثلاً مذاقِ صحیح، خاندانی محبت یا تعلقات وغیرہ۔ لہٰذا دولت کے کامل تعلقات کے لیے کسی اور ایسے خاصہ کا

معلوم کرنا ضروری ہے جو اُس کو دیگر اشیاء سے متمیز کرے۔ یہ خاصہ قابلیتِ انتقال یا قدر کا زرِ نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتا ہے۔ پس دولت سے مراد ان خارجی اشیاء کی ہے جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے اور جو انسان کی ذاتی ملک ہوں۔ اور جن کی قدر تبادلے میں زر نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتی ہو۔ یہ پیمانہ ایک طرف تو اس سعی و کوشش کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کی وساطت سے یہ اشیاء پیدا ہوئی ہوں۔ اور دوسری طرف ان انسانی ضروریات کو جن کو یہ پورا کرتی ہیں۔ مختصر طور پر یوں کہہ دو کہ ''دولت'' میں انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے وہ تمام جائز و مناسب اور ممکن الحصول وسائل داخل ہیں جو بالفعل یا بالقوۃ قابل انتقال ہوں۔ اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف وہی شے دولت کہلا سکتی ہے۔

۱۔ جو کوئی خاص شے ہو، خواہ مادّی خارجی ہو، خواہ غیر مادّی خارجی۔

۲۔ جس کی خواہش انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے خیال سے جائز اور مناسب طور پر کی جاسکتی ہو۔ افریقہ کا ایک وحشی اپنے دشمن کے سر کی خواہش کر سکتا ہے، مگر یہ خواہش اخلاقی لحاظ سے جائز اور مناسب نہیں ہے۔

۳۔ جو ممکن الحصول ہو۔

۴۔ جس پر انسان کو حق ملکیت حاصل ہو۔

۵۔ جس میں قابلیتِ انتقال ہو۔ یا یوں کہو کہ جس کی قدر تبادلے میں زر نقد کے پیمانے سے متعین ہو سکتی ہو۔

دولت[1] کی مندرجہ بالا تعریف میں ہم نے لفظ ''قدر'' کو استعمال کیا ہے، جو علم اقتصاد کی ایک ضروری اصطلاح ہے۔ دولت کی تعریف کماحقہ سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس

---

[1] فلسفہ تمدن کا فرض منصبی یہ ہے کہ انسانی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد معلوم کرے۔ لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے مختلف وسائل اور قابل عمل طریق معلوم کرنا اس علم کا کام نہیں ہے۔ بلکہ یہ کام علم الاقتصاد، فن تعلیم اور علم تدبیر مملکت کا ہے۔ تحقیقات تمدنی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تمدن کی ترقی کے لیے تین ضروری شرائط ہیں۔

(ا) نظام قدرت کے قوائے مخفیہ کو معلوم کرنا اور ان سے مستفید ہونا۔ مثلاً زمانہ حال میں برقی قوت سے جو

نظام قدرت کے قوای میں سے ہے۔ انسان بے انتہا فائدہ اٹھاتا ہے۔

(۲) تمدنی تعلقات کی تکمیل - مثلاً میاں بی بی کا رشتہ بعض اقوام کے نزدیک ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔ بعض اس کو ایک معمولی معاہدہ سمجھتے ہیں۔ انسانی تمدن کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ تمام تمدنی تعلقات کے صحیح مفہوم معلوم کر کے ان کے مطابق عمل درآمد کیا جائے۔

(۳) افراد کے ذاتی قوای کی ترقی۔ مثلاً تعلیم و تربیت وغیرہ۔ نمبر ۲ اور ۳ کی تحقیقات اور بحث علم تدابیر مملکت اور فن تعلیم کے متعلق ہے۔ مگر چونکہ نمبر ا کی تحقیق علم الاقتصاد کا فرض ہے اس واسطے اس ضمن میں چند سطور لکھنا ضروری ہے۔ بعض لوگوں کی رائے میں نظام قدرت کے مخفی قوای کے معلوم کرنے سے انسانی زندگی میں ایک قسم کا تصنع اور بناوٹ آجانے کا اندیشہ ہے جو اس کی فطرت صحیحہ کے مخالف ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرتاً ایک ایسی ہستی ہے جو اپنی زندگی کا ایک خاص مقصد مقرر کرتی ہے۔ اور پھر اسی کے اعتبار سے اپنے عمل کو متعین کرتی ہے۔ پس اس لحاظ سے ہر کامل انسانی زندگی میں تصنع کا آنا ضروری بلکہ لازمی ہے۔ اس قسم کے اعتراضوں سے ہمیں یہ فائدہ اٹھانا چاہیے کہ نظام قدرت کے ان مخفی قوای کو معلوم کریں جو حقیقۃً ہمارے لیے مفید ہیں۔ مثلاً لفظ ''دولت'' کا اصل مفہوم معلوم کرنا اور ان اسباب کو معلوم کرنا جن کی وساطت سے دولت پیدا ہوتی ہے۔ ''تاریخ علم الاقتصاد'' کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کے مفہوم میں کئی تغیر آئے ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ موجودہ مفہوم صحیح اور آخری ہو جس میں اب کوئی تغیر آنے کا امکان نہیں ہے۔ ایک زمانہ میں سمجھا جاتا تھا کہ دولت اور زر نقد مرادف الفاظ ہیں۔ اس غلط مفہوم سے ایک ایسا مغالطہ پیدا ہوا جس کو نظام تجارت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مختلف ممالک کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ دیگر ممالک سے اشیاء کا خریدنا گویا اپنے ملک سے زر نقد کا باہر نکالنا ہے۔ اس خیال سے حتی المقدور اپنی اشیاء فروخت کرتے تھے۔ اور دیگر ممالک کی اشیاء پر اس قدر محصول لگا دیتے تھے کہ وہ ملک میں بکنے ہی نہ پاویں۔ اس مغالطہ کو پہلے ایڈم سمتھ صاحب نے ظاہر کیا اور دولت کی تعریف اس طرح پر کی کہ یہ ان مادی اشیاء کا مجموعہ ہے جو انسان کے لیے مفید ہیں۔ جب تک یہ خیال قائم رہے گا دولت ایک قسم کی مادی شے تصور کی جاوے گی۔ اور ان اشیاء کے برخلاف ایک قسم کا تعصب پیدا ہو تا جائے گا جو انسانی حاجات کو رفع تو کرتی ہیں لیکن بادی النظر میں ہمارے وسائل زندگی کو زیادہ نہیں کرتیں۔ مثلاً بڑے بڑے صناعوں کی کھینچی ہوئی تصویریں۔ آخر یہ تعریف بھی مقبول نہ ہوئی اور محققین علم الاقتصاد کو بتدریج یہ محسوس ہوتا گیا کہ مادے کی مختلف اقسام کی قدر انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لحاظ سے مختلف حالات میں مختلف ہوتی ہے۔ لہٰذا انھوں نے مندرجہ بالا تعریف میں اشیاء کی جگہ ''مفیدات'' کا لفظ استعمال کرنا شروع کیا اور دولت کی تعریف اس طرح پر کی کہ یہ ان مفیدات کا مجموعہ ہے جو انسانی

ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ لیکن یہ تعریف بھی مشکلات سے خالی نہیں ہے کیونکہ لفظ ضرورت کا مفہوم مشکوک ہے۔ ممکن ہے کہ جس شے کو ہم اپنی ضرورت سمجھے ہوئے ہیں حقیقت میں ہماری ضرورت نہ ہو۔ اگر ہماری ظاہری ضروریات ہمیں بربادی کی طرف لے جاویں تو ان ضروریات کو پورا کرنے کے اسباب ہرگز دولت نہیں قرار دیے جاسکتے۔ لہٰذا دولت کا اصل مفہوم معلوم کرنے سے پیشتر ہمیں اپنی حقیقی اور ظاہری ضروریات کے درمیان امتیاز کرنا ضروری ہے۔ یہاں ایک اور مشکل پیش آتی ہے۔

انسان کی حقیقی ضروریات اس کی ظاہری ضروریات سے متمیز نہیں ہو سکتیں۔ جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو کہ انسان کی حقیقی بہبودی کیا ہے۔ اس کے علاوہ تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج اور حالات ہیں۔ دولت کی مختلف اقسام کی وقعت مختلف ہوتی ہے اور ان کی قدر صرف ان ضروریات کے لحاظ سے ہی متعین نہیں ہوتی جن کو وہ پورا کرتی ہیں بلکہ اس بات پر بھی منحصر ہوتی ہے کہ انسان ان کو کس نگاہ سے دیکھتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا اثر بالعموم ہماری نگاہ میں ایک قسم کا تغیر پیدا کر دیتا ہے اور بسا اوقات ہم ان اشیاء کو دولت نہیں سمجھتے جن کو تعلیم پانے سے پہلے دولت تصور کیا کرتے تھے۔ غرض عملی طور پر مفید ہونے کے لیے علم الاقتصاد کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام علوم کی تحقیقات سے فائدہ اٹھائے جن کا مدعا انسان کی زندگی کا افضل ترین مقصد اس کی حقیقی بہبودی اور اس کی تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج معلوم کرنا ہے۔ موجودہ حالات میں جہاں تک ہمیں ان امور کا علم حاصل ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ضروریات زندگی دو قسم کی ہوتی ہیں۔

اول وہ اشیاء جو قیام زندگی کے لیے ضروری ہیں۔

دوم وہ اشیاء جو خاص خاص حالات اور تمدنی حیثیات کے لحاظ سے ضروری ہیں مثلاً گاڑی گھوڑا رکھنا۔ بعض حالات میں محض فضول خرچی ہے لیکن بعض حالات میں ضروریات سے ہے۔ اگر ہر مطلوب شے کو جو ان ہر دو اقسام میں نہیں آتی اسباب تعیش و تنعم یا تن آسانی میں داخل سمجھا جاوے تو ظاہر ہے کہ اسباب تعیش میں مندرجہ ذیل اشیاء شامل ہوں گی۔

(۱) وہ تمام اشیاء جو ان اشیاء سے مشابہ تو ہیں جو اوپر کی ہر دو اقسام میں آتی ہیں، تاہم معمولی حالات میں نہ ضروریات زندگی میں سے ہیں نہ ان اشیاء میں سے ہیں جو خاص خاص حالات اور تمدنی حیثیات میں ضروری ہیں۔

(۲) وہ تمام اشیاء جو بالعموم مطلوب تصور کی جاتی ہیں مگر انسان کی بہبودی کے لیے ضروری نہیں ہیں۔

(۳) وہ اشیاء جن سے ایک قسم کی عارضی لذت حاصل ہوتی ہے تاہم انسانی بہبودی پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(۴) وہ اشیاء جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسانی زندگی کو ایک اعلیٰ مقام تک رسائی حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ مثلاً کتابیں اور فن مصوری کے کرشمے۔ پہلی قسم کی قدر کافی طور پر واضح ہے۔ کیونکہ انسان اپنے

اصطلاح کا مفہوم ذہن نشین ہو۔ فرض کرو کہ میرے پاس ایک گھڑی ہے۔ میں اسے بیچ کر اپنی ضروریات پورا کرنے یا اوروں سے خدمت لینے کی قدرت رکھتا ہوں۔ یہ قدرت مجھے کہاں سے حاصل ہوئی؟ صرف اُس گھڑی کی وساطت سے۔ اگر یہ شے میرے پاس نہ ہوتی تو مجھ میں یہ قدرت بھی نہ ہوتی۔ پس "قدر" اس قدرت یا قوت کا نام ہے جو کسی شے کی وساطت سے اس شے کے قابض کو حاصل ہوتی ہے اور جس کو تبادلے میں دے کر وہ شخص بلالحاظ جبر واکراہ یا تاثرات ذاتی اوروں کی پیداوار محنت کو حاصل کر سکتا ہے۔ مختصر طور پر یوں کہہ دو کہ قدر قوتِ تبادلہ کا نام ہے۔

اس تعریف کے الفاظ پر غور کرو۔ ہم نے کہا ہے بلا جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی-کوئی مطلق العنان بادشاہ اپنی رعایا کو جہاں چاہے لڑنے مرنے کے لیے بھیج سکتا ہے۔ مگر یہ خدمات علم اقتصاد کے دائرہ میں نہ آئیں گی۔ کیونکہ ان کی بنا جبر و اکراہ پر ہے۔ برخلاف ان کے انگریزی سپاہی کی خدمات دائرہ علم اقتصاد میں داخل ہیں کیونکہ وہ اپنی مرضی سے ایک خاص تنخواہ کے عوض فوجی خدمت قبول کرتا ہے۔ اسی طرح اس ماں کی خدمات بھی دائرہ

کاروبار میں فطرتاً کسی قدر آسائش کو بھی چاہتا ہے۔ دوسری اور تیسری قسم کچھ وقعت نہیں رکھتی۔ خصوصاً جبکہ ان اقسام کی اشیاء کا حاصل کرنا ان اشیاء کے حصول سے متناقض ہو جو اعلیٰ تر وقعت رکھتی ہیں۔ ہاں چوتھی قسم کی اشیاء پر غور کرنا ضروری ہے۔ ان میں سے بعض مثلاً کتابیں وغیرہ انسانی ترقی کے لیے اس قدر ضروری ہیں کہ بعض انسان ان کے لیے اصل ضروریات زندگی کو ترک کرنا گوارا کریں گے۔ مگر ان اشیاء کو تیسری قسم کی اشیاء سے متمیز کرنا ذرا مشکل ہے۔ بعض اشیاء جن سے عارضی لذت حاصل ہوتی ہے انسانی زندگی کو تازگی اور شگفتگی بخشنے کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف یہ بھی سچ ہے کہ بعض پرانی مہذب قوموں کی بربادی عارضی لذات کی جستجو اور ان اشیاء سے بے پروا رہنے کی وجہ سے ہوئی جن سے انسانی زندگی کو حقیقی موت اور جلا حاصل ہوتی ہے۔ زمانہ حال کی تہذیب اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ لذیذ اور مفید میں امتیاز کیا جائے اور اس امتیاز کو ملحوظِ خاطر رکھ کر اپنے افعال و اعمال کو مرتب کیا جائے۔ تاکہ ہمیں اپنی زندگی کی اصل غرض یعنی بہبودی بنی نوع انسان کے حصول میں آسانی ہو۔

علم اقتصاد سے خارج ہیں جو اپنے بیمار بچے کی حفاظت میں بعض دفعہ جان بھی دے دیتی ہے۔ کیونکہ اس کی بنا ذاتی تاثرات یا محبت پر ہے۔

اس تعریف کو مختصر طور پر بیان کرتے ہوئے ہم نے کہا ہے کہ ''قدر'' قوتِ تبادلہ کا نام ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر کے تعین کے لیے تبادلہ ضروری ہے۔ مگر تبادلے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی اور فرد بھی ہو جس کے ساتھ تبادلۂ اشیاء کیا جاوے۔ اب اس تعریف کے لحاظ سے دیکھو کہ آیا عقل، ہنر اور فطری قویٰ جن کو انسان کے ذاتی اوصاف کے نام سے موسوم کیا جاسکتا ہے قدر کہتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ اشیاء ناقابل انتقال ہیں۔ یا بالفاظ دیگر ان کا تبادلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ انسان کی ذات سے منفک نہیں ہوسکتے۔ بعض حکماء کا قول ہے کہ چونکہ قدر کے لیے اشیاء میں قابلیت انتقال کا ہونا ضروری ہے۔ اس واسطے ذاتی اوصاف قدر سے معرّا ہیں اور دولت میں شامل نہیں ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگرچہ انسان کے ذاتی اوصاف یا فطری قویٰ میں قابلیت انتقال نہیں ہے تاہم ان کے استعمال میں یہ قابلیت موجود ہے۔ ہم اپنے فطری قویٰ کو کسی اور شخص کی خاطر استعمال کر کے اس سے حق الخدمت حاصل کر سکتے ہیں۔ بڑھئی کا ہنر نہ صرف اوروں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے بلکہ بالواسطہ اس کی اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے بھی ایسا ہی لازمی ہے جیسا کہ اس کے اوزار وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض محققین نے محاورۂ متعارف کی رو سے اگرچہ لفظ ''دولت'' کا اطلاق اشیاء خارجی پر کیا ہے۔ تاہم انسان کے فطری قویٰ کو اس کی ذاتی دولت کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس رائے کے لحاظ سے کسی ملک کے لوگوں کا ہنر، دیانت داری وغیرہ بھی اس ملک کی دولت میں شامل ہیں۔ مگر بعض اہل الرائے نے بغیر کسی امتیاز کے ذاتی دولت کو بھی دولتِ متعارف میں داخل سمجھا ہے۔ ان کے نزدیک دولت میں تین قسم کی اشیاء داخل ہیں۔

۱- وہ ممکن الحصول اشیاء مادی خارجی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے اور جن پر انسان کو قانوناً یا رواجاً حق ملکیت حاصل ہو۔

۲- وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادی خارجی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے اور جو اس کی ملکیت میں ہوں۔ اور جن کی وساطت سے اشیاء مادی حاصل کی جاسکیں۔ مثلاً حقوق خدمتِ ملازمین اور تجارتی تعلقات وغیرہ۔

۳- وہ ممکن الحصول اشیاء غیر مادّی اندرونی جن کی جائز اور مناسب طور پر خواہش کی جاسکے۔ مثلاً انسان کے فطری قویٰ۔ ہمارے نزدیک پہلی رائے زیادہ قرین صواب معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ دونوں میں صرف ایک لفظی فرق ہے، معنوی فرق کوئی نہیں۔ قدر کے بیان سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہو گی کہ دولت اور بہبودی مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ اکثر اشیاء ہماری بہبودی کے لیے ضروری ہیں۔ تاہم دولت کے مفہوم میں شامل نہیں ہیں۔ مثلاً اگر آزاد دستکاروں کو غلام تصور کیا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت کی مقدار میں اضافہ ہو گا مگر انسان کی بہبودی کے لیے یہ امر مضرت رساں ہو گا۔ اسی طرح دولت کی مقدار کا مسئلہ ہے۔ بعض دفعہ کچھ عرصہ کے لیے ایسے اسباب فراہم ہو جاتے ہیں جو ملکی ترقی کے لیے ممد ہوں۔ مثلاً کلوں کی ایجاد چھوٹے اوزار استعمال کے دائرہ سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ ملکی ترقی کا انحصار بہت کچھ اس قسم کی ایجادات پر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تہذیب و تمدّن کی ترقی کے ساتھ ساتھ دولت کی مقدار دن بدن کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ اگر آبادی بڑھتی نہ جاتی اور انسانی ضروریات اور حاجات کا دائرہ دن بدن وسیع نہ ہوتا جاتا تو علم الاقتصاد کے موضوعات کا احاطہ بھی تنگ ہوتا جاتا۔ یہاں تک کہ اس علم کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ اس ضمن میں یہ واضح کر دینا بھی لازم معلوم ہوتا ہے کہ دولت اور جائیداد بھی ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔ کیونکہ اس امتیاز کا علم محصول آمدنی کی بحث میں کام آئے گا۔ فرض کرو کہ ایک قطعہ زمین ایک شخص کے لیے تو دولت ہو گی، جو اس کا لگان وصول کرتا ہے اور جو اپنے قرض کی عدم ادائیگی کی صورت میں اسے بیچ کر اپنی رقم وصول کر سکتا ہے مگر ملک کے لیے یہ زمین دولت نہ ہو گی۔ کیونکہ اگر فک الرہن ہو جائے تو ملک کی دولت میں کوئی تغیر نہ ہو گا۔ اس امتیاز کو زیادہ وضاحت سے یوں بیان کرسکتے ہیں کہ زمین مذکورہ تو دولت ہے کیونکہ ایک خاص معین قدر رکھتی ہے مگر رہن دولت نہیں۔ بلکہ جائیداد یا دولت کی ایک خاص مقدار کو حاصل کرسکنے

یا استعمال میں لاسکنے کا حق ہے جو مرتہن کو حاصل ہے۔ یعنی مالک زمین کی جائیداد کی مقدار اس زمین کی قدر منفی حق مرتہن کے برابر ہے۔ اس مثال میں دولت تو ایک ہی ہے مگر جائیدادیں دو ہیں۔ ایک تو اصل مالک کی جائیداد، دوسری مرتہن کی۔ زمین کی ملکیت خواہ ایک ہو خواہ کئی جائیدادوں پر منقسم ہو، ملک کی دولت میں کوئی تغیر واقع نہ ہو گا۔ حقیقت یہ ہے کہ علم الاقتصاد کو لفظ جائیداد سے سروکار نہیں ہے۔ کیونکہ اس لفظ کا مفہوم اقتصادی نہیں، بلکہ قانونی ہے۔

علم الاقتصاد کی ماہیت کو واضح کرنے کے لیے اصطلاحات ''دولت'' و''قدر'' کے معنی کا بالصراحت بیان کرنا ضروری تھا۔ اس واسطے مندرجہ بالا سطور ہم کو لکھنی پڑیں۔ اب ہم پھر اصل مضمون کی طرف عود کرتے ہیں اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ علم الاقتصاد کے ابتدائی اصول کیا کیا ہیں۔ اس ضمن میں کئی سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ اصول اولیہ اور واقعات کیا ہیں جن کی بنا پر علم الاقتصاد کا ماہر اپنے استدلال کو قائم کرتا ہے؟ کیا اس استدلال میں ان تمام واقعات کا ملحوظ رکھنا ضروری ہے، جو دولت پر اثر کرتے ہیں یا صرف چند ضروری واقعات پر قناعت کرنی چاہیے؟ کیا نتائج کلیہ پر پہنچنے کے لیے انسان کی حقیقی فطرت کا مطالعہ لازم ہے؟ یا اس غرض کے لیے ہمیں ایک خیالی انسانی فطرت کا تصور کرنا چاہیے جس کا ہر فعل اوروں کے لیے نمونہ ہو؟ کیا مختلف ممالک کے حالات زمین و آب وہوا اور زرعی قابلیت اور لوگوں کے عادات اور ان کے اوضاع و اطوار کا معلوم کرنا ضروری ہے یا صرف انھی حالات و اوصاف کا علم ضروری ہے جو بالاشتراک ہر قوم میں پائے جاتے ہیں؟ ان سوالوں کے جواب پر علم اقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق منحصر ہے۔ مگر اس بارے میں حکماء کے درمیان بڑا اختلاف رائے ہے۔ بعض کے نزدیک اس علم کے ابتدائی اصول صرف چند واقعات ہیں جن کا تعلق انسانی فطرت، انسانی تمدن اور کرہ ارض کی طبعی بناوٹ کے ساتھ ہے۔ اور بعض کے نزدیک علم الاقتصاد کے ماہر کا یہ فرض منصبی ہے کہ انسانی فطرت کے کسی ایسے واقعہ کو نظر انداز نہ کرے جس کا تعلق دولت یا دولت کی تقسیم اور پیدائش کے ساتھ ہو۔ لہٰذا ان حکماء کی رائے میں جوں جوں انسانی فطرت کا علم وسیع ہوتا جاتا ہے توں توں علم

الاقتصاد بھی وسعت حاصل کرتا جاتا ہے۔ ایک محقق جو ان حکماء کے طبقۂ مؤخر الذکر میں داخل ہے کہتا ہے کہ ماہرین علم الاقتصاد کے فرائض مندرجہ ذیل ہیں۔

۱- ان بڑے بڑے اصولوں کا معلوم کرنا جو حصول دولت پر اثر کرتے ہیں۔

۲- انسان کی دماغی بناوٹ کے بعض ضروری واقعات کا معلوم کرنا جن کا تعلق انسانی فطرت کے ساتھ ہے۔

۳- پیدائش دولت کے قدرتی اسباب کے بڑے بڑے طبعی خواص معلوم کرنا۔

۴- دیگر اسباب کا تحقیق کرنا جو انسانی افعال پر اثر کرتے ہیں جن کا مقصود حصول دولت ہو۔ مثلاً ملکی اور تمدنی رسوم، جدید ضروریات کا پیدا ہونا یا قوانین متعلقہ زمین وغیرہ۔ مگر ہماری رائے میں دونوں فریق راستی پر ہیں۔ علم الاقتصاد کے لیے ضروری ہے کہ اوّل چند خاص اصول بطور بناء کے قائم کیے جائیں اور پھر یہ معلوم کیا جائے کہ انسانی زندگی کے موجودہ حالات و واقعات سے ان ابتدائی اصولوں میں عملاً کیا تغیر پیدا ہوتا ہے۔ بہرحال علاوہ اور باتوں کے ماہرین علم الاقتصاد کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ اپنے علم کی بنیاد انسانی فطرت کے صحیح اصولوں پر قائم کریں، ورنہ ان کو صحیح اور کلی نتائج کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ فرضاً اگر اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ انسان بالطبع خود غرض ہے یا اس کی فطرت قدرتاً وصف ایثار سے کلی طور پر معرّا ہے۔ اور اس ابتدائی اصول کو اقتصادی استدلال کی بنیاد قرار دیا جائے تو ظاہر ہے کہ وہ تمام استدلالات جو اس اصول پر مبنی سمجھے جائیں گے غلط ہوں گے۔ کیونکہ حقیقتاً انسانی فطرت اس قسم کی نہیں ہے، بلکہ خود غرضی اور ایثار دونوں سے مرکّب ہے۔ اگر کسی قوم میں علم الاقتصاد کے ایسے اصول مروّج ہو جائیں جو اس قسم کے غلط مشاہدے پر مبنی ہوں تو وہ قوم ایک دو صدیوں کے عرصہ میں ہی ایک حیرت ناک اخلاقی تنزل کرے گی جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس قوم کے ہر فعل میں بے جا خود غرضی اور زر پرستی کی بو آئے گی، جو اس کو کسی نہ کسی دن حضیض ذلّت میں گرا کر چھوڑے گی۔

لہٰذا بعض مصنّفین نے فطرت انسانی اور دیگر حالات طبعیہ کو ملحوظ رکھ کر علم الاقتصاد کے لیے چند ابتدائی مفروضات یاعلوم متعارفہ قائم کیے ہیں جن پر تمام استدلالات اقتصادیہ مبنی ہیں۔ ان میں سے بڑے بڑے اصول مندرجہ ذیل ہیں:-

۱- بالعموم ہر انسان کم و بیش دولت کی خواہش رکھتا ہے۔

۲- سرمایہ دار اور محنتی قدرتاً ان مشاغل کو ترک کر دیتے ہیں، جن میں نفع یا اجرت کم ہو اور ایسے مشاغل کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں منافع یا اجرت زیادہ ہو لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ابتدائی اصول اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب کہ ملک میں ہر طرح سے امن ہو، غلامی کا دستور نہ ہو اور وہ تمام اسباب معدوم ہوں جو سرمایہ داروں اور محنتیوں کو تجارت کی ایک شاخ سے دوسری شاخ میں منتقل ہونے سے روکتے ہوں۔ ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اب سے ایک صدی پہلے ہندوستان میں یہ بات بہت مشکل تھی کہ کوئی شخص ایک شہر سے دوسرے شہر میں جا کر کاروبار کرے۔

۳- زمین کمیت یا مقدار میں محدود ہے۔ لیکن کیفیت یا خواص میں بالعموم ایک ملک کی زمین دوسرے ملک کی زمین سے مختلف ہوتی ہے۔

۴- دنیا کی زمین بالعموم اس قدر زرخیز ہے کہ معمولی علم و ہنر کے کاشتکار کا حاصل محنت اس مقدار سے زیادہ ہوتا ہے جو صرف اس کے ذاتی گزارے کے لیے کافی ہو۔

مندرجہ بالا سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ علم الاقتصاد منفرد واقعات کے مطالعہ سے قوانین کلیّہ بھی قائم کرتا ہے اور اپنے ابتدائی مسلّمہ اصولوں سے نتائج بھی پیدا کرتا ہے جن کی صحت یا عدم صحت واقعات کے ساتھ مقابلہ کرنے سے معلوم کی جاتی ہے یا بالفاظ اصطلاحی یوں کہو کہ یہ علم دیگر علوم کی طرح عمل استقراء اور عمل استخراج دونوں کے استعمال سے مستفید ہوتا ہے۔ اس مقام پر یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ تمام کلیہ قوانین واقعات پر مبنی ہوتے ہیں اور اس لحاظ سے ان کا عمل محدود ہوتا ہے۔ مگر علم الاقتصاد کے قوانین کلیہ خصوصیت کے ساتھ محدود ہیں۔ کیونکہ مختلف ممالک و اقوام کے اقتصادی اور تمدّنی حالات و

واقعات بعض صورتوں میں کم و بیش مختلف ہیں۔ مثلاً اس علم کے بعض قوانین مغرب کے ممالک کی نسبت تو صحیح ہیں، مگر ہندوستان کی صورت میں اختلافِ حالات کی وجہ سے صحیح نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض حکماء علم الاقتصاد کو ریاضی اور دیگر علوم کا ہم پایہ تصوّر نہیں کرتے۔ اور اس کو اقوام اور ممالک کے ساتھ مختص سمجھتے ہیں۔ ایک مصنّف نے حال ہی میں ایک کتاب لکھی ہے جس کو اس نے اقتصاد ہندی کے نام سے موسوم کیا ہے۔ مگر ہماری رائے میں یہ غلطی علم کو فن سے متمیز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علم کا کام صرف واقعات کے علل و اسباب معلوم کرنا ہے۔ یہ کسی طریق عمل پر مستحسن یا مذموم ہونے کا حکم نہیں لگاتا۔ برخلاف فن کے کہ اس کا فرض منصبی خاص واقعات کو ملحوظ رکھ کے کسی مقصد کے حصول کے لیے خاص خاص قواعد اور طریق عمل پیش کرنا ہے۔ ہماری رائے میں علمِ اقتصاد کا یہ کام نہیں کہ کسی ملک یا قوم کے لیے کوئی خاص طریقِ عمل پیش کرے یا کسی طریق پر حکم لگائے۔ لہٰذا ہم اس کو دیگر نظری علوم کی طرح ایک علم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ یہ تسلیم کرنے میں ہمیں عذر نہیں ہے کہ اس کے کلیہ اصولوں میں جدید واقعات کے لحاظ سے ایسا تغیّر آنا ممکن ہے۔ جس سے ان کی وسعت زیادہ ہو جائے اور ان کو نئے نئے واقعات پر حاوی کر دے۔

علم الاقتصاد کا تعلق دیگر علوم سے

علم اقتصاد اپنی تحقیق میں دیگر علوم سے بہت مدد لیتا ہے۔ مثلاً علم الابدان سے اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بقائے زندگی کے لیے ایک معین خوارک کی ضرورت ہے یا انسان کے شہوانی قویٰ آبادی کو زیادہ کرنے کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ ان ہر دو مسلّمات سے مسئلہ اجرت و آبادیٔ انسان کی بحث پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس علم کیمیا سے اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی قابلیت پیداوار کی ایک خاص حد ہے جس کو لگان کی بحث میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مگر یاد رہے کہ اگرچہ اس علم کے محقق کو دیگر علوم کی تحقیقات سے مدد لینی چاہیے۔ تاہم یہ بھی لازم ہے کہ وہ علم اقتصاد کی ذاتی حدود کو مد نظر رکھے اور ان بحثوں میں نہ پڑ جائے جن کا تعلق دولت کی تقسیم و تبادلہ وغیرہ سے نہیں ہے۔

علم الاقتصاد اور علم اخلاق

اگرچہ علم الاقتصاد دیگر علوم میں سے بعض کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتا ہے، مگر علم اخلاق کے ساتھ اس کا تعلق بہت گہرا ہے۔ اس علم کی طرح علم اخلاق کا موضوع بھی وہی اشیاء ہیں جو بعض انسانی مقاصد کے حصول سے وابستہ ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ علم اخلاق کا موضوع وہ افعال ہیں جو زندگی کے افضل ترین مقصد کے حصول کی شرائط ہیں اور علم الاقتصاد کا موضوع وہ اشیاء ہیں جو انسان کے معمولی مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسان کے معمولی مقاصد کی پوری قدر سمجھنے کے لیے ان پر اخلاقی مقاصد کے لحاظ سے نگاہ ڈالنی چاہیے۔ مثلاً خوراک، لباس، مکان، ہماری زندگی کے لیے ضروری ہیں اور ان کی قدر ان مقاصد کی قدر پر منحصر ہے جن کو یہ پورا کرتے ہیں۔ مگر زندگی کے ان معمولی مقاصد کی اصل وقعت صرف اس صورت میں معلوم ہو سکتی ہے جب ہم ان پر زندگی کے افضل ترین مقصد کے لحاظ سے غور کریں۔ اس لیے علم الاقتصاد کو وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لیے کسی قدر مطالعہ علم اخلاق کا بھی ضروری ہے۔ اکثر مصنفین نے اس صداقت کو محسوس نہیں کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت بلالحاظ زندگی کے افضل ترین مقصد کے بجائے خود ایک مقصد تصوّر کی گئی جس سے بعض تمدّنی اصلاحوں کے ظہور پذیر ہونے میں بے جا تعویق ہوئی اور دولت کے پیار کرنے والوں کی حرص و آز پہلے سے زیادہ تیز ہو گئی۔

علم الاقتصاد کا تعلق علم تمدّن سے

علم تمدّن وہ علم ہے جو انسانی زندگی کا افضل ترین مقصد اور اس کے حصول کے طریق معلوم کرتا ہے۔ اس علم کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ تمام دیگر علوم اس کی تحقیقات سے متاثر ہوتے ہیں کیونکہ بلاواسطہ یا بالواسطہ تمام علوم کا موضوع ذات انسان ہے، جو خصوصیت کے ساتھ علم تمدّن کا موضوع ہے۔ کسی شے کی حقیقی قدر و منزلت اس امر پر منحصر ہے کہ وہ کہاں تک ہماری زندگی کے اعلیٰ ترین مقصد کے حصول میں ہم کو مدد دیتی ہے یا یوں کہو کہ ہر

شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ تمدّنی لحاظ سے ہوتا ہے۔ دولت ہی کو لے لو۔ اگر یہ شے ہمارے افضل ترین مقاصد کے حصول میں ہم کو مدد نہیں دے سکتی، تو پھر اس کا کیا فائدہ؟ لہٰذا علم اقتصاد جس کا موضوع دولت ہے وسیع علم تمدّن پر مبنی ہے۔ جس کا منشاء ہر شے کی اصلی وقعت کا فیصلہ کرنا ہے۔ انسان کی زندگی کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ اور یہ تمام اشیاء دولت، صحت اور فرائض کی انجام دہی وغیرہ اس مقصد کے حصول کے مختلف ذرائع ہیں۔ چونکہ علم تمدّن کا منشاء ہمارے اعلیٰ ترین مقصد کی حقیقت کا معلوم کرنا ہے۔ اور ہماری روزمرہ کی ضرورت کی چیزوں کی حقیقی قدر اس علم کے لحاظ سے فیصلہ پاتی ہے۔ اس واسطے علم اقتصاد اور دیگر انسانی علوم علم تمدّن سے ایک نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ ایک معنی میں یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس پر مبنی ہیں۔

علم الاقتصاد کے مختلف حصص

علم اقتصاد کی ماہیت اور اس کا طریق تحقیق بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اس علم کے چار بڑے حصص بیان کرتے ہیں، جو تمام اقتصادی مسائل پر حاوی ہیں:

۱- دولت کی پیدائش　　۲- دولت کا تبادلہ

۳- دولت کی تقسیم　　۴- دولت کا صرف یا استعمال

اس کتاب کے آئندہ حصص میں علی الترتیب ان کا ذکر ہو گا مگر یاد رکھنا چاہیے کہ علم الاقتصاد کے حصص کی مندرجہ بالا تقسیم ہم نے منطقی وضاحت کی غرض سے کی ہے۔ ورنہ جیسا کہ تمھیں آگے چل کر معلوم ہو گا، یہ سب حصص آپس میں ایک گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ مثلاً اشیاء کے صرف یا استعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سی اشیاء ملک میں تیار کی جانی چاہییں۔ اسی طرح پیدائش دولت کی کیفیت اور کمیت اس کی تقسیم سے متاثر ہوتی ہے اور اگر انقسام محنت کا اصول پورے طور پر مروج ہو جائے تو پیدائش دولت سے تبادلہ لازم آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دولت کی تقسیم تبادلے سے متاثر ہوتی ہے۔

حصہ دوم

پیدائشِ دولت

باب اوّل

زمین

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان دولت پیدا کرتا ہے تو ہمارا مفہوم یہ نہیں ہوتا کہ انسان کسی شے کا خالق ہے یا اُسے عدم سے وجود میں لاتا ہے۔ دولت پیدا کرنے سے مراد محنت اور سرمایے کی مدد سے اشیاء میں صرف ایک خاص قدر کا پیدا کرنا ہے، جو اپنی اصلیت کے لحاظ سے مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کی گئی ہے۔

(الف) قدر مختص بالمکان یعنی وہ قدر جو کسی شے کو ایک مقام سے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے دوسرے مقامات میں جہاں اس کی ضرورت ہے، منتقل کرنے سے اُس شے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً کشمیر میں برف کی کوئی قدر نہیں لیکن اگر پنجاب میں منتقل کی جائے تو اس میں قدر پیدا ہو جائے گی۔

(ب) قدر مختص بالزمان یعنی وہ قدر جو کسی شے کو ایک خاص میعاد تک محفوظ رکھنے سے اُس شے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً سردی میں برف کا ایک ٹکڑا کچھ قدر نہیں رکھتا۔ لیکن اگر موسم گرما کی آمد تک اس کو کہیں دبا کر محفوظ رکھ دیا جائے تو اس میں ایک خاص قدر کا پیدا ہو جانا ممکن ہے۔

(ج) قدر مختص بالہیئۃ۔ یعنی وہ قدر جو کسی شے میں ایک خاص ہیئت پیدا کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً لوہے کی تلوار جو کسی مشین کی مدد سے تیار کی جائے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب ہم اصل مطلب شروع کرتے ہیں۔ دولت کی پیدائش کے تین بڑے وسائل ہیں۔ یعنی زمین، محنت اور سرمایہ۔ مگر بعض کی رائے میں تنظیم محنت بھی پیدائشِ دولت کی بڑی مد ہے۔ لہٰذا بعض محققین نے اس کو بھی وسائلِ پیدائش میں شمار کیا ہے۔ اس باب میں ہم صرف زمین کے متعلق کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

زمین انسان کے لیے ایک قدرتی عطیہ ہے جس کے استعمال پر نہ صرف اس کی موجودہ زندگی اور آسائش کا انحصار ہے بلکہ اس کی وسعت نسل انسانی کی زیادہ سے زیادہ آبادی اور اس کی مدتِ بقا کو بھی متعین کرتی ہے۔ چونکہ زمین کی مختلف قسموں کی قابلیت پیداوار مختلف ہے۔ اس واسطے مختلف مقامات میں انسانی محنت کا معاوضہ بھی مختلف ہے۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہر انسانی ضرورت بلا واسطہ یا بالواسطہ اس قدرتی عطیے کے مناسب استعمال سے پوری ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دولت کے اس وسیع سرچشمہ کو زیادہ زرخیز کرنے یا اپنی ضرورت کے مطابق اُس کی قابلیتوں میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے نئے نئے وسائل دریافت کرتا ہے۔ پیداوار زمین کی کمی بیشی، اس کی زرخیزی اور دیگر مقامی خصوصیات مثلاً آب و ہوا، پانی کی افراط وغیرہ پر منحصر ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایک اہم اور نہایت ضروری قانون کے ساتھ وابستہ ہے جس کا اچھی طرح ذہن نشین کر لینا طالب علم کے لیے ضروری ہے۔

اس قانون کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں قانون تقلیل حاصل کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہر زمین کی قابلیت پیداوار کی ایک خاص حد مقرر ہے یا یوں کہو کہ پیداوار کی زیادہ سے زیادہ مقدار جو سرمایے اور محنت کے عوض میں کسی خاص زمین سے حاصل ہو سکتی ہے، ایک خاص معین اندازہ رکھتی ہے۔ جب کوئی زمین ہمارے سرمایے اور محنت کے عوض میں زیادہ سے زیادہ پیداوار دے تو ہم کہتے ہیں کہ اس کی کاشت نقطۂ تقلیل پر پہنچ گئی ہے۔ یعنی اس معین مقدار کے حاصل کر چکنے کے بعد سرمایے اور محنت کے دُگنا کر دینے سے یہ ضروری نہیں کہ زمین مذکور کی پیداوار بھی دُگنی ہو جائے۔ بلکہ دُگنی پیداوار حاصل کرنے کے لیے دُگنے سے زیادہ سرمایے اور محنت کی ضرورت ہو گی۔ اگر محنتیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جائے تو ہر محنتی کا حصہ پیداوار کم ہو جائے گا اور اس کو کم تر معاوضے پر قناعت کرنی پڑے گی۔ اسی طرح اگر سرمایے میں اضافہ کر دیا جائے تو پیداوار کی زیادتی اس زیادتی سے کم ہو گی جو کاشت کے نقطۂ تقلیل تک پہنچنے سے پیشتر اس اضافہ سے حاصل ہوتی۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک قطعۂ زمین پر جس کی وسعت سو ایکڑ ہے اور جس کی

سالانہ پیداوار دو ہزار من غلہ ہے، دس آدمی مشترک طور پر کام کرتے ہیں۔ اس حساب سے ایک ایکڑ کی پیداوار بیس من ہوئی اور فی کس دو سو من آئے۔ لیکن اگر محنتیوں کی مذکورہ جماعت میں دو آدمی اور شامل ہو جائیں اور فن زراعت کی ترقی سے زمین کی زرخیزی کی کوئی نئی راہ نکل آئے تو کیا اس زمین کی پیداوار مندرجہ بالا حساب سے دو ہزار چار سو من ہو گی یا اس سے کم و بیش؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے پہلے اس امر کا دیکھنا ضروری ہے کہ آیا پہلے دس آدمیوں کی محنت اور سرمایے سے زمین مذکور کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ گئی تھی۔ اگر کاشت اس نقطہ تک نہیں پہنچی تو آیندہ سال کی پیداوار دو ہزار چار سو من سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ انقسام محنت کی وجہ سے جس کے فوائد کا ذکر باب سوم میں آئے گا۔ دس آدمیوں کی نسبت بارہ آدمی زیادہ غلہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ چکی ہے تو دو آدمیوں کی زیادتی سے پیداوار دو ہزار چار سو من سے کم ہو جائے گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ بارہ آدمیوں میں ہر آدمی کو دو سو من سے کم پر قناعت کرنی پڑے گی۔ اس طرح سرمایے اور محنت کی زیادتی سے پیداوار ہر سال زیادہ ہوتی جائے گی اور حصہ فی کس کم ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ زمین کی کاشت کے نقطہ تقلیل تک پہنچ جانے سے پیداوار پھر کم ہونی شروع ہو جائے گی اور حصہ فی کس پہلے سے بھی کم ہوتا جائے گا۔ یہ کمی اوّل اوّل تو بتدریج ہو گی، مگر بعد میں اس کی سُرعت میں یہاں تک ترقی ہو گی کہ زمین مذکورہ کا قطعہ موجودہ محنتیوں کے گزارے کے لیے بالکل ناکافی ہو گا۔ غالباً اس قانون کے عمل نے آریہ ہندوؤں سے وسط ایشیا کے میدان چھڑوائے اور حضرت لوط علیہ السلام کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جدا کیا جیسا کہ تورات میں مذکور ہے۔ اگر زمین کی کاشت میں سرمایے اور محنت کے بڑھتے جانے سے بالآخر نقطۂ تقلیل تک پہنچ جانے کا میلان نہ ہوتا، تو ہر مزارع تھوڑے سے قطعہ زمین کی کاشت پر قناعت کرتا اور اس پر اپنا سرمایہ اور محنت صرف کر کے بہت سی پیداوار حاصل کر لیا کرتا اور لگان کے ایک بہت بڑے حصے کی ادائیگی سے بچ رہتا جو اب وسیع قطعات کی کاشت سے اس کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

اس قانون کی مزید وضاحت کے لیے ایک محقق سرمایے اور محنت کی زیادتی کو دوا کی خوراک سے تعبیر کرتا ہے اور زمین کو مریض قرار دیتا ہے۔ اگر کسی زمین کے ایک قطعہ پر کچھ سرمایہ اور محنت صرف کی جائے اور اس کی پیداوار صرف خرچ ہی کے برابر ہو تو اس محقق کی اصطلاح میں ایسی زمین کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ وہ کنارہ زراعت پر ہے۔ رفتہ رفتہ زیادہ سرمایے اور محنت کے صرف سے پیداوار زیادہ ہو جائے گی۔ یہاں تک کہ کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ جائے گی اور مزید سرمایے اور محنت سے پیداوار میں کوئی متناسب زیادتی نہ ہو گی۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ سرمایے اور محنت کا حاصل جو مندرجہ بالا قانون کے تحت میں ہے، پیداوار کی مقدار سے متعین ہوتا ہے۔ جو اس سرمایے اور محنت کے عوض میں دستیاب ہوتی ہے۔ پیداوار مذکور کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کو اس حاصل کی تعیین میں دخل نہیں ہے۔ ہاں جب ہم اس قانون سے نتائج استخراج کریں گے اور بالخصوص اس اثر پر بحث کریں گے جو آبادی کی زیادتی سے وسائل زندگی پر ہوتا ہے، اس وقت قیمت کے تغیرات پر بھی بحث کرنا لازم ہو گا۔ ان تغیرات کو نفس قانون سے واسطہ نہیں۔ کیونکہ اس کا تعلق پیداوار کی قدر سے نہیں ہے بلکہ اس کی مقدار سے ہے۔

اس قانون کا عمل عام ہے اور یہ ہر ملک کے حالات پر صادق آتا ہے۔ اس کا اثر صرف مزروعہ زمین تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ چراگاہوں، جنگلوں اور سمندر کی پیداوار بھی اس قانون کے احاطۂ عمل میں ہے۔ اگرچہ بعض حالات میں کلوں اور دیگر ایجادات کی وجہ سے اس کا اثر چنداں ظاہر نہیں ہوتا۔ مصنوعی اشیاء بھی اس کے اثر سے آزاد نہیں ہیں۔ کیونکہ اُن کا ہیولیٰ یا مصالح جس سے وہ تیار ہوتی ہیں زمین یا سمندر ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ مگر مصنوعات کی مختلف اقسام پر اس کا اثر اس محنت کی مقدار کے لحاظ سے ہوتا ہے جو ان کی تیاری میں صرف کی جائے۔ قینچی کو ہی دیکھ لو۔ لوہے کو زمین سے نکالنے کا خرچ اس محنت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں جو اس کی تیاری میں صرف کی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کان کی مشکلات بڑھ جانے کی وجہ سے لوہے کی قیمت دُگنی بھی ہو جائے تو قینچیوں کی قیمت پر کچھ اثر نہ ہو گا۔ کیونکہ ان کی قیمت کے تعین میں اس محنت کو دخل ہے جو ان کی تیاری میں صرف

ہوتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ جو قومیں اس قسم کی دستکاری میں مصروف ہیں جو مصالح پر اپنا عمل کرتی ہیں، اُن کو اس قانون سے متاثر ہونے کا اندیشہ نہیں ہے۔ کیونکہ اُن کی مصنوعات کی قیمت کم و بیش ان کی دستکاری اور محنت سے متعین ہوتی ہے۔ جس میں مصالح کے خرچ پیداوار کو بہت کم دخل ہے۔ مگر جو ملک زیادہ تر مصالح پیدا کرتے ہیں اور مصنوعات کی تیاری سے عاری ہیں، اُن کو اس قانون کے نتائج پر غور کرنا چاہیے، بالخصوص ہندوستان کے لوگوں کو۔ کیونکہ ابھی اس ملک کو صنعتی ملک کے نام سے موسوم نہیں کرسکتے۔ اگر اس ملک کے لوگ زیادہ تر صنعت کی طرف توجہ کریں، تو ان کی مالی حالت روز افزوں ترقی کرے گی اور مفلسی کے عذاب اور دیگر مصائب سے نجات ملنے کی صورت نظر آئے گی۔ کیونکہ اور ملکوں کی طرح اس ملک کو مصالح باہر سے منگوانے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

ہم نے اوپر بیان کیا ہے جب کہ زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ جاتی ہے تو اس کی قابلیتِ پیداوار کم ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ معمولی کاشت ہی اُس کے اندرونی خواص کو زائل کرتی جائے بلکہ بعض چند ایسے قدرتی اسباب بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو اس کی زرخیزی کو انتہا درجہ کا نقصان پہنچاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ علم طبعی کے نتائج کی رو سے کوئی شے عدم محض نہیں ہو سکتی بلکہ صرف اُس کی ماہیت تبدیل ہو جاتی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ عدم محض محال ہے تاہم کوئی مفید شے بدل کر ایسی ہیئت یا صورت اختیار کرسکتی ہے جو انسان کے لیے بالکل کار آمد نہ ہو۔ مثلاً جب کوئی مکان جل کر خاک سیاہ ہو جاتا ہے تو بالکل معدوم نہیں ہوتا بلکہ ایک مفید ہیئت سے ایک غیر مفید ہیئت اختیار کرلیتا ہے۔ اسی طرح زمین کے مفید اندرونی خواص انسان کے معمولی کاشت یا دیگر مضرت رساں قدرتی اسباب سے حقیقی طور پر فنا نہیں ہو جاتے بلکہ ایسی صورت اختیار کرلیتے ہیں جو ہماری ضروریات کے لحاظ سے غیر مفید ہوتی ہے۔

زمین کے اس خاصے کی بنا پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہندوستان چونکہ صنعتی ملک نہیں ہے، اس واسطے یہ دیگر ممالک کے لیے ایک طرح کا ذخیرہ بن گیا ہے، جہاں سے وہ اپنے صنعتی کارخانوں کے لیے مصالح حاصل کرتے ہیں اور پھر اُس مصالح کو اپنی دستکاری کے عمل

سے نئی نئی مصنوعات کی صورت میں تبدیل کر کے دیگر ممالک اور ہندوستان میں بھیج کر بے انتہا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں چونکہ قانون تقلیل حاصل کے عمل کو روکنے کے اسباب بہت قلیل ہیں۔ لہٰذا جو اشیاء ہندوستان میں دیگر ممالک سے آتی ہیں ان پر قانوناً بہت سا محصول لگنا چاہیے۔ جس کا فائدہ یہ ہو گا کہ دیگر ممالک کے تاجر اپنی صنعتی اشیاء اس ملک میں نہ بیچ سکیں گے۔ اور اگر بیچیں گے تو اُن کو کچھ فائدہ کی توقع نہ ہو گی۔ کیونکہ زیادہ محصول کی وجہ سے اُن اشیاء کی قیمت گراں ہو جائے گی اور یہاں کے لوگ اُن کو خریدنے سے باز رہیں گے۔ اس طرح ہمیں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے خود اپنا محتاج ہونا پڑے گا اور ہماری صنعت کو ترقی ہو گی۔ اس طریق عمل کو ''حفاظت تجارت'' یا ''تامین تجارت'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور اس کا مقصد یہ ہے کہ تمام ممالک باہمی ایک دوسرے کے دست نگر نہ ہوں۔ بلکہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے اپنے ملک کے پیدا کردہ مصالح سے خود تیار کریں۔ اس دلیل سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مندرجہ بالا طریق عمل کا مقصد قوموں کے باہمی تعلقات کو قطع کرنا ہے۔ یہ نتیجہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ تامین تجارت کے مؤیدوں کا مقصد ہر ملک کے لوگوں کو صنعت کی طرف مائل کرنا ہے نہ اُن کے باہمی تعلقات کو زائل کرنا۔ جو شے کسی ملک میں سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتی وہ بمجبوری دیگر ممالک سے حاصل کی جائے گی اور اس طرح تجارتی تعلقات بدستور قائم رہیں گے۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مصالح پیدا کرنے والوں اور صنعتی اشیاء کے تیار کرنے والوں کو باہمی خرید و فروخت کرنے میں پوری آزادی حاصل ہے۔ اس واسطے کسی قسم کا محصول لگانا گویا انسان کی آزادی پر حملہ کرنا ہے۔ مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ بسا اوقات کسی خاص فرد کا فائدہ عام افراد قوم کے فوائد سے متناقض ہوتا ہے تاہم مذکورہ بالا دلیل میں دو امور نظر انداز کیے گئے ہیں جن پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔

۱- اوّل تو یہ کہ نظام قدرت خود بخود اس کمی کو پورا کرتا ہے جو زمین کی قابلیت پیداوار کے رفتہ رفتہ کم ہوتے جانے سے لاحق ہوتی ہے۔ مثلاً بڑی بڑی چٹانوں کا تحلیل ہو کر وسیع قطعاتِ زمین کی صورت میں متبدل ہوتے جانا۔

۲-دوئم زمین کے انسانی استعمال میں اس کے کچھ نہ کچھ حصے کا ضائع ہونا ضروری ہے۔ بلکہ بڑے بڑے تجارتی قصبوں کی تعمیر سے بھی یہ بات رُک نہیں سکتی اور کچھ نہیں تو ایسے قصبوں میں کچھ حصۂ زمین ان نہروں کی تیاری ہی میں صرف کرنا پڑے گا جن کی وساطت سے کوڑا کرکٹ وغیرہ سمندر میں پھینکا جاتا ہے۔

قصہ کوتاہ یہ بحث بڑی دلچسپ ہے اور اس کے نتائج مختلف ممالک کے حالات پر منحصر ہیں۔ ہم اس پر زیادہ خامہ فرسائی نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس کا فیصلہ ناظرین کی رائے پر چھوڑتے ہیں۔

باب دوم

محنت

دولت کی پیدائش کا دوسرا وسیلہ محنت ہے جس سے مراد وہ جسمانی یا غیر جسمانی (دماغی) سعی ہے جو کسی مقصد کے حصول کے لیے کی جاتی ہے۔ قطع نظر اس خوشی یا لذت کے جو اس سعی کے دوران میں حاصل ہو۔ قدرت مصالح یا ہیولیٰ مہیا کرتی ہے، مگر محنت اس کی مختلف اقسام پر اپنا عمل کرنے سے یا ان کو مطلوبہ ہیئت میں تبدیل کرنے سے اس ہیولیٰ کو انسانی ضروریات کے پورا کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اس قمیص کو ہی لو جو تم پہنتے ہو۔ اس کو موجودہ مفید صورت میں لانے کے لیے محنت کے مختلف اعمال کا کس قدر طویل سلسلہ درکار ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مصنفین اور علماء کی تصانیف جن کا منشاء قوم کی اصلاح کرنا یا علوم کی اشاعت وغیرہ ہو، خالص دماغی محنت کی مثالیں ہیں۔

تہذیب و تمدن کے اقل درجہ کی حالت میں انسان کی ضروریات قدرت کی فیاضی سے خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔ محنت کی احتیاج نہیں ہوتی اور جب تک یہ حالت قائم رہتی ہے، اشیاء میں وہ خاصیت بھی پیدا نہیں ہوتی جس کو قدر کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ انسان دیگر حیوانات کی طرح خودرو پھلوں پر یا شکار پر گزران کرتا ہے۔ اس حالت کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آبادی کم ہو، قحطوں کا تواتر ہو اور زندگی کو قائم رکھنے کے لیے قبائل انسانی میں باہمی جنگ وجدل کا سلسلہ قائم رہے۔ مگر جب انسان اس وحشیانہ حالت سے ترقی کر کے حالت شبانی تک پہنچتا ہے، تو اقتصادی معنوں میں محنت کا ظہور ہوتا ہے۔ اس حالت میں بنی آدم قدرت کی فیاضی کے بھروسے ہی نہیں رہتے، بلکہ مختلف جنگلی حیوانوں کو اپنے قبضے میں لاتے ہیں۔ پانی کے غیر مستقل ذخیرے کے لیے نہریں کھودتے ہیں۔ بلکہ آیندہ خشک سالی کی فکر سے خورد و نوش کا سامان جمع کرنا اور اپنے حیوانوں کی حفاظت کرنا بھی سیکھتے ہیں۔ غرض کہ

محنت کی مندرجہ بالا صورتوں کی وساطت سے وہ تمام اشیاء دولت بن جاتی ہیں، جو انسان کی وحشیانہ حالت میں اس خاصیت سے معرّا تھیں۔ تمدن کی اس حالت میں آبادی دن بدن زیادہ ہوتی ہے اور خورد و نوش کا سامان صرف کثیر ہی نہیں ہوتا بلکہ بیرونی خطرات سے محفوظ بھی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ انسان کی ذاتی محنت سے قحطوں کا تواتر رُک جاتا ہے اور ان کے گزارے کی سبیل یقینی ہو جاتی ہے۔ آخر کار یہ مرحلہ بھی طے ہو جاتا ہے اور انسان ترقی کر کے اس حالت تک پہنچتا ہے جس کو حالت زراعتی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ خانہ بدوشی چھوٹ جاتی ہے۔ آبادی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اور محنت کا ہاتھ زمین کے مخفی خزانوں کو غلہ اور دیگر اجناس کی صورت میں نکالنا شروع کرتا ہے۔

اوپر کی سطور سے واضح ہو گیا ہو گا کہ پیدائش دولت کے لیے محنت لازم ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر محنت دولت آفریں نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کی دو بڑی اصناف قرار دی گئی ہیں۔ یعنی

۱- محنت بار آور

۲- محنت غیر بار آور

مقدم الذکر سے مراد وہ محنت ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ مسلسل طور پر مزید دولت پیدا کرتی رہے اور آخر الذکر سے مراد اُس محنت کی ہے جو مسلسل طور پر مزید دولت پیدا نہ کر سکے۔ مثلاً مفید اور ضروری اشیاء تیار کرنے والے معماروں، آہن گروں یا سپاہیوں اور استادوں کی محنت بار آور ہے۔ برخلاف اس کے آتش بازی بنانے والے کی محنت غیر بار آور ہے۔ کیونکہ آتش بازی کا دستکار بجائے اس کے کہ مسلسل طور پر مزید دولت پیدا کرے قومی دولت کو کم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ کسی جگہ صرف دو آدمی آباد ہیں۔ ایک کے پاس دس روپے ہیں اور دوسرے کے پاس پانچ۔ یعنی اُن کا کل سرمایہ پندرہ روپے ہے۔ فرض کرو کہ جس شخص کے پاس پانچ روپے ہیں وہ اپنا سرمایہ آتش بازی کی تیاری میں صرف کرتا ہے اور شے مذکور کے تیار ہونے پر اُسے اپنے تماشہ پسند ساتھی کے پاس لے جاتا ہے جو آتش بازی کو دس روپیہ پر خرید لیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں کا سرمایہ جو پہلے پندرہ

روپے تھا، اب صرف دس روپے رہ گیا ہے۔ جو آتش باز کے قبضہ میں ہے۔ کیونکہ آتش بازی اپنے مالک کو ایک عارضی خوشی دے کر تھوڑی دیر کے بعد بالکل معدوم ہو جائے گی۔ لہٰذا تمام غیر بار آور محنت جو اسباب تن آسانی پر صرف ہوتی ہے، اگرچہ بادی النظر میں سرمایہ داروں کو محنت بار آور کے مانند منافع خیز معلوم ہوتی ہے (جیسا کہ مثال بالا میں ہمارے آتش باز کو اپنی تجارت سے پانچ روپیہ منافع معلوم ہوتا ہے) تاہم انجام کار قومی دولت کی مقدار کو کم کرتی ہے۔ کیونکہ یہ محنت اور سرمایہ جو اس پر صرف ہوتا ہے گویا ایسی اشیاء کی تیاری میں صرف ہوتا ہے جو کچھ عرصہ بعد قدر سے معرا ہو کر بالکل معدوم ہو جاتی ہیں اور اس وجہ سے مسلسل طور پر مزید دولت کے پیدا کرنے کا ذریعہ نہیں بن سکتیں۔ اگر غور سے دیکھو گے تو تمھیں معلوم ہو گا کہ بخیلوں اور عشرت پسندوں کا وجود قومی دولت کے لیے یکساں مضرت رساں ہے۔ بخیل بھی عشرت پسندوں کی طرح دولت کو ایک طرح سے فنا ہی کرتا ہے کیونکہ جو دولت صندوق میں بند رہے اور مزید دولت کے پیدا کرنے میں صرف نہ ہو اُس کا عدم اور وجود برابر ہے۔ غرض کہ محنت کا بار آور یا غیر بار آور ہونا اور سرمایہ کا بار آور یا غیر بار آور طور پر استعمال ہونا مزید دولت کے پیدا کر سکنے یا نہ کر سکنے کی قابلیت پر منحصر ہے۔ معلم کی محنت بار آور ہے کیونکہ وہ اوروں کو اس قابل بناتا ہے کہ مزید دولت پیدا کریں۔ علیٰ ہذا القیاس سپاہی کی محنت بھی بالواسطہ بار آور ہے کیونکہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرتا ہے جو مزید دولت پیدا ہونے کی ایک ضروری شرط ہے۔ اسی طرح دیگر دستکاروں یعنی معماروں، آہن گروں وغیرہ کی محنت بھی بشرطیکہ اسباب تن آسانی پر صرف نہ ہو بار آور ہے۔ کیونکہ اُن کی محنت سے ایسی اشیاء تیار ہوتی ہیں، جن سے سلسلہ وار مزید دولت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ برخلاف گوٹا بنانے والے کی محنت کے کہ اُس کا نتیجہ ایک ایسی شے ہے جو خریدنے والے کو ایک عارضی خوشی یا آسائش تو دیتی ہے لیکن کچھ عرصہ کے بعد فنا ہو کر دولت کی آیندہ پیدائش کے سلسلہ کو یک قلم منقطع کر دیتی ہے۔ مندرجہ بالا امتیاز کی بناء اس امر پر ہے کہ ہر ملک میں بعض دستکار اور سرمایہ دار تو ایسے ہوتے ہیں جو اپنی محنت اور سرمایے کو ضروریات زندگی کے پیدا کرنے میں صرف کرتے ہیں اور بعض صرف اسباب عشرت و تن آسانی ہی کو

پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے حالات زندگی، اس کے خیالات و قویٰ میں ایک قسم کا تغیر آتا رہتا ہے جس سے یہ امکان ہو جاتا ہے کہ جو چیز اس سے سو سال پہلے اسباب تن آسانی میں سے تصور کی جاتی اب اخلاقی حالات کی وجہ سے ضروریات زندگی میں شمار کی جائے لہٰذا تہذیب و تمدن کے اعلیٰ مدارج میں ضروریات زندگی اور اسباب تن آسانی یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ محنت بار آور اور غیر بار آور میں تمیز کرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا توضیح پر دو اعتراض ہو سکتے ہیں:

١- فرض کرو کہ ایک استاد بیس لڑکوں کو تعلیم دیتا ہے جن میں سے آخر کار دس طلباء معزز عہدوں پر ممتاز ہوئے مگر باقیوں نے مرفہ الحال ہونے کی وجہ سے کوئی ملازمت یا تجارت وغیرہ نہ کی۔ ظاہر ہے کہ محنت بار آور کی تعریف کی رو سے استاد کی محنت کا وہ حصہ جو پہلے دس کی تعلیم پر صرف ہوا ہے، بار آور ہے۔ کیونکہ اُس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا ہو رہی ہے لیکن وہ حصہ جو باقی دس کی تعلیم پر صرف ہوا ہے، غیر بارآور ہے کیونکہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا نہیں ہوتی۔ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قسم کی محنت ایک حالت میں بار آور اور دوسری حالت میں غیر بار آور ہو؟ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ علم اقتصاد واقعات کے اسباب و علل معلوم کرتا ہے اور اس بات پر بحث کرتا ہے کہ اگر بعض مانع اسباب نہ پیش آ گئے تو فلاں واقعہ اس طرح پر ظہور پذیر ہو گا۔ استاد کی محنت دونوں صورتوں میں بارآور ہونے کا میلان رکھتی ہے لیکن چونکہ دوسری صورت میں طلباء کی بے پروائی یا دیگر موانع پیش آ گئے ہیں، اس واسطے غیر بار آور ہو گئی ہے۔

٢- تم شاید یہ کہو گے کہ اگر کسی شے کے بار آور استعمال سے یہی مراد ہے کہ اس سے مسلسل طور پر مزید دولت پیدا ہوتی جائے تو جو روپیہ ہم لنگڑوں، اپاہجوں اور معذوروں کو بطور خیرات کے دیتے ہیں، وہ بھی غیر بار آور طور پر صرف ہوتا ہے کیونکہ اس سے کوئی مزید دولت پیدا نہیں ہوتی۔ بے شک یہ خیال صحیح ہے اور اسی خیال سے ایک مشہور انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ علم الاقتصاد کے اصول اور نتائج انسان کے ذاتی تاثرات کے صریح

مخالف ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ اگر اس علم کے اصول کی رو سے خیرات کا روپیہ غیر بار آور طور پر صرف ہوتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ خیرات دینی ہی نہیں چاہیے۔ علم الاقتصاد واقعات پر بحث کرتا ہے نہ کہ فرائض انسان پر۔ نظری طور پر کسی امر کا صحیح ہونا اس بات کا مستلزم نہیں ہے کہ وہ امر اس وجہ سے ہمارے فرائض سے ہی خارج ہے۔ فرائضِ انسان کی تعیین علم الاقتصاد کا کام نہیں ہے۔ بلکہ ان کا فیصلہ علم اخلاق کے اصول پر ہوتا ہے، جو بحیثیت ایک علم ہونے کے علم الاقتصاد سے الگ ہے بلکہ اگر تم غور کر کے دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ نظام تمدن کے بقاء اور اس کے استحکام کے لیے یہ ضروری ہے کہ قومی دولت کا کچھ حصہ فنا بھی ہوتا رہے۔

اس امتیاز کا اصلی مفہوم ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ جاننا ضروری ہے کہ کسی ملک میں محنت کی پیداوار کا کم و بیش ہونا مندرجہ ذیل اسباب پر منحصر ہے۔ خواہ وہ ملک حالت شبانی میں، خواہ زراعتی حالت میں، خواہ تہذیب و تمدن کے اس درجہ پر ہو جبکہ صنعت و تجارت انتہائے عروج پر ہوتی ہیں۔

۱- دستکاروں یا محنتیوں کی کارکردگی۔

۲- انقسام محنت یا محنت کے مختلف اعمال اور حصص کا مختلف افراد پر تقسیم کرنا اور اس طریق سے اُن کی تخصیص و تنظیم کرنا۔

محنت کی کارکردگی

محنتی کی کارکردگی کئی اسباب پر منحصر ہے:

اوّل- اس کی موروثی ہمت یا قویٰ جو قدرت نے اُسے عطا کیے ہوں۔ قدرت کا عطیہ مختلف اقوام کی حالت میں مختلف ہے۔ بعض قومیں قدرتاً قوی اور مضبوط ہوتی ہیں بعض قدرتاً دُبلی پتلی اور مقابلتاً ضعیف۔ یہی حال افراد کا ہے مگر اس اختلاف کی علت پر بحث کرنا علم الاقتصاد کا کام نہیں ہے۔

دوم- محنتی کی غذا کی کیفیت اور کمیت۔

سوم۔ محنتی کا سامان حفظ صحت، صاف اور ہوادار مکانوں میں رہنے سے اس کی صحت پر ایک نمایاں اثر ہو گا۔ جس سے اس کی ہنر مندی ترقی کرے گی۔

چہارم۔ محنتی کی فطرتی ذہانت۔ ذہین محنتی بہ نسبت غبی محنتی کے کئی وجوہ سے زیادہ کارکن ہوتا ہے۔

۱۔ تو اسے اس امر کی ضرورت نہیں ہوتی کہ اُس کی شاگردی کی مدت طویل ہو۔

۲۔ اس پر نگرانی کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہوتی۔

۳۔ وہ اشیاء کی تیاری میں کم نقصان کرتا ہے۔

۴۔ وہ کل کا استعمال جلد سیکھ جاتا ہے۔

۵۔ زندگی کی دوڑ میں بڑھنے کی آرزو، جو سچی خودداری اور غیرت سے پیدا ہوتی ہے اور اس امر کا یقین کہ پیداوار محنت کی افزائش کے ساتھ ساتھ اس کا حصہ بھی بڑھتا جائے گا۔

مندرجہ بالا اسباب میں سے پہلے تین اسباب طبعی ہیں۔ چوتھا عقلی اور پانچواں اخلاقی ہے۔ تم کو معلوم ہے غلاموں کی محنت آزاد محنتیوں کی محنت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ غلاموں کی محنت کارکردگی کی وقعت سے کیوں معرا ہے؟

صاف ظاہر ہے کہ آزاد محنتیوں کی طرح اسے زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے اور اپنے ہمراہیوں پر فوقیت لے جانے کی کوئی خواہش نہیں ہوتی اور نہ ہو سکتی ہے۔ تازیانہ کا خوف ان قویٰ کو حرکت میں نہیں لا سکتا جن کی تحریک صرف تمنائے دولت اور خودداری کی خلش سے ہوتی ہے۔ آزاد محنتیوں کی صورت میں بھی اُجرت کا قطعی اور یقینی ہونا ان کے لیے انتہا درجہ کا قوی محرک ہوتا ہے اور اگر کسی مالک کا نہیں بلکہ اپنا کام کر رہے ہوں تو اپنی محنت کی کارکردگی کے زیادہ کرنے میں اور بھی کوشش کرتے ہیں۔ وجہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنی محنت کی پیداوار کا پورا مالک تصور کرتے ہیں۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

حقِ ملکیت ایک اکسیر ہے جو تانبے کو سونا بنا دیتا ہے۔

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ بعض ممالک میں قانون ہی کچھ اس ڈھب کے وضع کیے جاتے ہیں کہ قوم کے دستکار اُن کے اثر سے دن بدن سُست ہوتے جاتے ہیں۔ کیونکہ بسا اوقات یہ قانون اُن کو اپنی محنت کا پورا فائدہ اٹھانے سے روکتے ہیں۔ کچھ عرصہ گذرا ہے ملک سکاٹ لینڈ میں قوانین متعلقہ مزارعین اس طرح سے وضع کیے گئے تھے کہ ان بے چاروں کی جانکاہی کوہ کندن وکاہ بر آوردن کی مصداق تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُن لوگوں کے مزاج میں دن بدن کاہلی ترقی کرتی گئی۔ مگر جب اس قسم کے بیہودہ قوانین منسوخ کر دیے گئے تو انھوں نے اپنی جبلی چستی اور استقلال کو پھر حاصل کر لیا۔ پس یہ تمام اسباب ہیں جو محنت کی کارکردگی میں اختلاف پیدا کرتے ہیں۔

انقسامِ محنت

کسی قوم کی قوتِ محنت[1] کا دوسرا جزو انقسامِ محنت ہے۔ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں ہر انسان اپنی ذاتی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے سارا کام خود کرتا ہے۔ اپنی جھونپڑی کا معمار بھی آپ ہی ہوتا ہے اور اپنے شکار کے لیے تیر و کمان اور دیگر اوزار بھی آپ ہی تیار کر لیتا ہے۔ مگر اس حالت میں بھی کسی نہ کسی حد تک انقسامِ محنت کا اصول عمل میں ضرور آتا ہے۔ عورت سوت کاتتی ہے۔ پہننے کے لیے کپڑے تیار کرتی ہے۔ کھانا پکاتی ہے۔ لیکن مرد اور کام کرتا ہے جن میں قوت اور چستی کی زیادہ ضرورت ہے۔ رفتہ رفتہ محنت کا انقسام جنسیت کے امتیاز پر مبنی نہیں رہتا، بلکہ ذاتی قابلیت کے اختلاف پر مبنی ہو جاتا ہے۔ افراد میں سے کوئی لوہار، کوئی زرگر، کوئی بڑھئی بن جاتا ہے اور اس طرح آخر کار ہر پیشہ کے مختلف حصے مختلف محنتیوں کے ساتھ مختص ہوتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر ممالک میں ذات پیشہ کے لحاظ سے قرار دی جاتی ہے۔ ہندوستان کو ہی لو ہمارے ہاں اصول انقسام محنت کا اثر اس درجہ تک ہوا کہ درزی، لوہار، بڑھئی وغیرہ ذاتیں قرار پا گئیں اور اس امتیاز پر اس قدر بے جا زور دیا گیا کہ اس کے مضرت رساں نتائج بالکل نظر انداز کر دیے گئے۔ اس میں کوئی

---

[1] کسی قوم کی قوت محنت سے مراد اس قوم کے دستکاروں کی تعداد، ان کا ہنر اور ان کی ذہانت وغیرہ ہیں۔

شک نہیں کہ تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں یہ امتیاز قوموں کے لیے مفید ہو سکتا ہے لیکن کسی شے کے ایک خاص صورت میں مفید ہونے سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ وہ شے ہر حالت میں مفید ہے۔

انقسامِ محنت سے دولت کی پیداوار روز افزوں ترقی کرتی ہے۔

۱- اس کی وجہ سے شاگردی کی مدت کم ہو جاتی ہے کیونکہ جب محنتی کو کسی پیشے کا صرف ایک خاص حصہ ہی سیکھنا ہو گا تو ظاہر ہے کہ اس کے سیکھنے کی مدت اس مدت سے بہت کم ہو گی جو اس پیشہ کی تمام شاخوں کے سیکھنے میں صرف ہوتی۔

۲- ایک خاص شاخ کی مزاولت سے اس کے ہاتھ کی صفائی بڑھ جائے گی۔

۳- جب ایک محنتی کسی پیشے کی ایک خاص شاخ کے لیے مختص ہو جائے گا تو اُس کو اس پیشے کی دیگر شاخوں سے کوئی سروکار نہ ہو گا اور عدم انقسام کی صورت میں جو وقت ایک شاخ سے دوسری شاخ کی طرف جانے اور پیشے کے مختلف اعمال کی ادل بدل میں صرف ہوتا تھا، انقسام محنت کی صورت میں بچ جائے گا۔

۴- چونکہ ہر محنتی کی توجہ پیشے کی کسی خاص شاخ یا عمل پر مبذول رہا کرے گی، اس واسطے وہ اپنے مقررہ کام کو سہولت، آسانی اور صفائی کے ساتھ سرانجام دینے کی راہیں ایجاد کرنے کی کوشش کرے گا۔ اگرچہ دنیا کی بڑی بڑی ایجادات علمی ترقی کا نتیجہ ہیں، تاہم اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ان کا بہت سا حصہ اصول انقسام محنت کے اثر سے ظہور میں آیا ہے۔

۵- انقسامِ محنت کا ایک نتیجہ یہ بھی ہو گا کہ کام محنتیوں کی قابلیت کے مطابق تقسیم ہو گا لہٰذا بچے اور عورتیں بھی اپنی اپنی قابلیت کے مطابق ملک کی دستکاری سے بہرہ ور ہوں گی۔

مندرجہ بالا سطور سے یہ تو تمھیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ انقسامِ محنت کسی ملک کی صنعت کے لیے کہاں تک مفید ہے۔ لیکن اگر اسی اصول کو دنیا کی تمام اقوام و ممالک پر وسعت دی جاوے تو یا یوں کہو کہ محنت کی مقامی تقسیم کی جاوے تو اس کے فوائد اور بھی نمایاں معلوم ہوں گے۔

ہر ملک وہی شے پیدا کرے گا جس کے پیدا کرنے کی خصوصیت کے ساتھ اُسے قابلیت ہے اور اس طرح رفتہ رفتہ وہ ملک اس خاص شے کے پیدا کرنے میں کمال حاصل کرتا جائے گا۔

جو لوگ اصول "تامین تجارت" کے مخالف ہیں۔ اُن کی بڑی دلیل یہی ہے کہ قوموں کے تجارتی تعلقات پر کسی قسم کی روک پیدا کرنا گویا لوگوں کو اُن بڑے بڑے فوائد سے محروم کرنا ہے جو محنت کی مقامی تقسیم کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ اپنی ضرورت کی چیزیں اسی ملک یا بازار سے خریدے، جہاں وہ کم سے کم قیمت پر دستیاب ہو سکتی ہیں۔

تم جانتے ہو کہ ہر قوم کے تمدنی اور ملکی حالات کم و بیش مختلف ہیں۔ لہٰذا اُن کی دستکاری میں بھی کم و بیش اختلاف ہے۔ کسی کو کسی شے کی تیاری میں کمال حاصل ہے۔ یا ملکی اور قومی حالات کی وجہ سے ہو سکتا ہے اور کسی کو کسی اور شے کی تیاری میں۔ اگر اس قدرتی امر کو ملحوظ خاطر رکھ کر دنیا کی محنت کو اس طور پر مرتب و منتظم کریں کہ ہر ملک انھیں اشیاء کے پیدا کرنے میں مصروف رہے جن کے تیار کرنے میں اُسے خاص طور پر قابلیت حاصل ہے۔ یا یوں کہو کہ دستکاری کی مختلف شاخیں ایک نہ ایک قوم یا مقام کے ساتھ مختص سمجھی جائیں، تو ظاہر ہے کہ اس تنظیم سے بے انتہا فوائد منتج ہوں گے۔ محنت کی کارکردگی پر ایک نمایاں اثر ہو گا۔ بنی نوع انسان ایک بڑے جسم کی طرح ہیں، کہ مختلف ممالک یا اقوام اس کے اعضا ہیں، جو اپنے اپنے مقررہ فرائض کی انجام دہی سے "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" کا پورا مفہوم ظاہر کرتے ہیں۔ اور اس طرح جسم کی پرورش اور ترتیب کرتے ہیں۔ پس قطع نظر ان فوائد کے جو انقسام محنت سے پیدا ہوتے ہیں اور جن کا اُوپر ذکر کیا گیا ہے۔ تنظیم محنت کا اوّل تو یہ فائدہ ہو گا کہ دستکاری کی مختلف شاخوں کی تقسیم سے مختلف پیشہ وروں کے کام کی خوبی کا مقابلہ ہو سکے گا جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کے درمیان ایک قسم کا رشک پیدا ہو جائے گا اور ہر پیشہ ور اس رشک کے جوش میں سعی کرے گا کہ اس کا کام خوبی میں اوروں کے کام سے بہتر ہو۔ علاوہ اس کے تنظیم محنت کی وجہ سے مالکوں یا کارخانہ داروں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو جائے گی، جو اپنی ذاتی منفعت کی خاطر ہمیشہ یہ سوچتے رہیں گے کہ ملک کی دستکاری مفید ترین راہوں میں صرف ہو۔ اگرچہ مالکوں کی ایک علیحدہ جماعت کے قائم ہو

جانے سے اوّل اوّل کسی قدر نقصان ہو گا۔ کیونکہ دستکار کو اپنے کام میں وہ ذاتی دلچسپی نہ رہے گی، تاہم مجموعی طور پر اس جماعت کا اثر مفید ہو گا۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ تنظیم محنت کے لیے یہ ضروری ہے کہ دستکاری کے مختلف مرکزوں کے درمیان پیام رسانی اور ارتباط کے دیگر ذرائع کا پورا انتظام ہو، ورنہ بیگانگی اور عدم تعلق سے بعض اوقات خوفناک نتائج پیدا ہونے کا اندیشہ ہو گا۔

۱۸۶۰ء میں جب کہ ممالک مغربی و شمالی ایک ہیبت ناک قحط کی مصیبت سے پامال ہو رہے تھے، بعض اضلاع میں چاول کا نرخ چار روپیہ فی من تھا مگر بعض اضلاع میں دو روپیہ من سے بھی کم تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف اضلاع کے درمیان تجارتی تعلقات کو قائم رکھنے کے لیے کافی سڑکیں موجود نہ تھیں، جن کی وجہ سے قحط زدہ اضلاع اُن اضلاع کی پیداوار سے فائدہ اٹھا سکتے جن میں مقابلتاً ارزانی تھی۔ موجودہ حکام ہندوستان کی دور اندیشی سے اب اس ملک کے مختلف حصص میں تجارتی تعلقات پیدا ہونے کا سامان دن بدن زیادہ ہوتا جاتا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ آیندہ اس قسم کے دردناک مصائب کا تواتر نہ ہو گا۔ اس ضرورت کے لحاظ سے ایک محقق اس بات پر زور دیتا ہے کہ بستیاں آباد کرنے والوں کے قطعاتِ زمین قریب قریب ہونے چاہییں ورنہ ہر جماعت صرف وہی اشیاء پیدا کرے گی، جو اُن کی ذاتی ضروریات کے پورا کرنے کے لیے کافی ہو گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اُن کے درمیان تجارتی تعلقات پیدا نہ ہوں گے اور اُن کو ان تمام خطرات کا اندیشہ رہے گا جو عدم سلسلہ آمدورفت سے پیدا ہوتے ہیں۔

اب ہم مختصر طور پر گذشتہ دو باتوں کی بحث کا نتیجہ تحریر کرتے ہیں تاکہ مندرجہ بالا امور وضاحت کے ساتھ ذہن نشین ہو جائیں۔ باب اوّل میں تمھیں معلوم ہو چکا ہے کہ پیدائش دولت کے قدرتی اسباب ایک بڑے قانون کے تابع ہیں جس کو قانون تقلیل حاصل کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مگر باب دوم میں ہم نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ تنظیم محنت سے پیدائش دولت انتہا درجہ کی ترقی کرتی ہے۔ اگر قانون تقلیل حاصل کی رو سے پیداوار دولت میں نقطہ تقلیل تک پہنچ کر دن بدن کم ہوتے جانے کا میلان ہے، تو تنظیم

محنت فن زراعت کی ترقی اور اس فن کی دیگر متعلقہ ایجادات اور سرمایہ کا زیادہ دور اندیشی سے استعمال کرنا اس کی افزائش کے اسباب ہیں۔

انسان کی آبادی دن بدن بڑھتی جاتی ہے اور تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ اس کی ضروریات بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ لہٰذا اگر وہ صرف قدرتی اسباب کی پیدائش کے بھروسہ پر رہتا اور اپنی روز افزوں ضروریات کے پورا کرنے کی نئی نئی راہیں نہ نکالتا۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اپنی عقل کے زور سے قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا، تو اس کے امن و آسائش میں انتہا درجہ کا خلل پیدا ہوتا، بلکہ اس کی نسل کا بقا ہی محال ہو جاتا۔ پس ظاہر ہے کہ اصول تنظیم محنت اور اصول تقلیل حاصل ایک دوسرے کے حریف ہیں جن میں ایک قسم کی جنگ چلی جاتی ہے۔ جس سے پیدائش دولت میں اعتدال قائم رہتا ہے اور اعتدال ہی ہر شے کی جان ہے۔

باب سوم

سرمایہ

نوع انسان کے ابتدائی مراحل تہذیب میں سرمایہ کا وجود مطلق نہ تھا۔ پیداوار دولت کے صرف دو وسائل تھے۔ یعنی محنت اور زمین۔ مگر موجودہ نظام تمدن میں سرمایہ دولت کی پیدائش کے لیے ایسا ہی ضروری ہو گیا ہے جیسا کہ محنت اور دیگر قدرتی اسباب۔ اس لیے دولت کی پیدائش ناممکن ہے، جب تک کہ موجودہ صرف میں سے کچھ حصہ بچا کر مزید دولت کے پیدا کرنے میں استعمال نہ کیا جائے۔ لہٰذا نظام تمدن کی موجودہ صورت میں کسی ملک کا سرمایہ اس ملک کی دولت کا وہ حصہ ہے جو دولت کی آیندہ پیدائش کے لیے الگ رکھا جائے۔[1] کسی ملک کی دولت کا وہ حصہ جو اسباب تن آسانی پر صرف کیا جاتا ہے یا اسباب تن آسانی کی تیاری میں لگایا جاتا ہے، بادی النظر میں تو سرمایہ دار کو نفع دیتا ہے لیکن چونکہ انجام کار قومی دولت پر اس کا اثر اچھا نہیں ہوتا، اس واسطے علم اقتصاد کے اصول کی رو سے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ حصہ بطور سرمایہ صرف ہوا ہے بلکہ اس کے استعمال کو غیر بار آور ہی کہا جائے گا۔ بشر طیکہ یقینی اور قطعی طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ اشیاء جو اس حصہ دولت کی وساطت سے تیار ہوتی ہیں یا خریدی جاتی ہیں، واقعی اسباب تن آسانی میں داخل ہیں۔ غرض کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور سرمایہ دار کے کم خرچ اور کفایت شعار ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

بعض مصنّفین کہتے ہیں کہ کسی ملک کی آب و ہوا بھی جہاں تک کہ مزید دولت کی پیدا وار میں مدد دیتی ہے، اس ملک کے سرمایے کا حصہ ہے۔ لیکن چونکہ دولت وہ شے ہے، جو تبادلے میں کوئی معین قدر رکھتی ہو۔ اس واسطے کسی ملک کے مفید قدرتی اسباب مثلاً آب و

[1] زمین افتادہ اور دیگر قدرتی اسباب جبکہ سرمایے اور محنت کی وساطت سے ان کی قابلیت افادت معمول سے زیادہ نہ ہو گئی ہو، سرمایے میں داخل نہیں ہیں۔ اس استثناء کی وجہ آگے معلوم ہو گی۔

ہوا یا اس کا جغرافی مقام وغیرہ، اس ملک کے سرمایے میں داخل نہیں تصور کیے جاسکتے، اگرچہ یہ پیدائش دولت کے ممد ضرور ہیں۔ سرمایے کی اصلیت مندرجہ ذیل مثال سے واضح ہو سکتی ہے۔

فرض کرو کہ انسانوں کا ایک قبیلہ سمندر کے کنارے پر آباد ہے اور مچھلی پر گزارہ کرتا ہے۔ جب مچھلی کثرت سے پیدا ہوتی ہے تو ان کے دن بھی اچھے گزر جاتے ہیں۔ مگر برعکس حالات میں ان لوگوں کو قحط کی مصیبت کا سامنا ہوتا ہے۔ اب فرض کرو کہ ان میں سے ایک آدمی اپنے ہم جنسوں کی نسبت امیرانہ گزارہ کرنے کی خاطر مچھلی کا ایک ذخیرہ جمع کرتا ہے۔ یہ ذخیرہ دولت تو ضرور ہے مگر اس کا سرمایہ ہونا اس کے استعمال پر منحصر ہے۔ اگر غیر بارآور طور پر استعمال ہو گا تو بطور سرمایہ صرف نہ ہو گا۔ لیکن اگر مزید دولت کی پیدائش میں صرف ہو گا تو سرمایہ کہلائے گا۔ بالفرض قحط کے موسم میں یہ شخص اپنے ذخیرے کو ساتھ لے کر کسی جنگل کی طرف نکل جاتا ہے اور وہاں جا کر فراغت سے ایک کشتی تیار کرتا ہے جس کی وساطت سے سمندر کے دور و دراز حصوں میں اس کی رسائی ہو سکتی ہے، جہاں ساحل کی نسبت زیادہ مچھلی مل سکتی ہے۔ اس صورت میں کشتی مذکور سرمایہ کہلائے گی اور یہ شخص سرمایہ دار ہو گا۔

اب اس شخص کے لیے تین راہیں کھلی ہیں:

اوّل- تو یہ کہ اپنی کشتی خود استعمال کرے اور ماہی گیری کی آمدنی سے اپنے ہم جنسوں کی محنت ایک خاص معاوضے کے بدلے خریدے اور اس طرح آرام میں بسر کرے۔

دوم- یا اپنی کشتی کسی اور کو اجارے پر دے دے اور خود ہاتھ پر ہاتھ دھرے گھر میں بیٹھا رہے۔

سوم- یا اپنی کشتی کسی اور کو اجارے پر دے دے اور خود اور کشتیاں تیار کرنے میں مصروف رہے۔ فرض کرو کہ کشتی بنانے والا تیسری راہ اختیار کرتا ہے اور اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی صنعت کے گاہک بہت ہیں۔ جوں جوں وہ زیادہ کشتیاں تیار کرے گا توں توں اُس کا ہاتھ بھی صاف ہوتا جائے گا اور وہ دن بدن اس قابل ہوتا جائے گا کہ اُجرت کے معاہدے پر اپنے دیگر ہم جنسوں کو بھی اپنے ساتھ اس کام میں لگائے۔ کیونکہ خریداروں کی

کثرت کی وجہ سے وہ اکیلا اتنی کشتیاں نہیں تیار کر سکے گا۔ اب اس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر اوروں کو بھی کشتیاں بنانے کی تحریک ہوگی اور کشتی گروں میں ایک قسم کی تجارتی رقابت شروع ہو جائے گی اور منافع کی شرح کم ہوتی جائے گی۔ آخر کار یہاں تک نوبت پہنچے گی کہ کشتیوں کی مزید مانگ نہ رہے گی اور اس وجہ سے سرمایہ دار کمی منافع کے خیال سے کشتی گری کو چھوڑ کر معماری کے کام پر اپنا سرمایہ صرف کرنے لگیں گے یا قبیلے کی دیگر ضروریات کا سامان مہیا کریں گے۔ اس طرح جوں جوں قبیلے کی ضروریات بڑھتی جائیں گی یا یوں کہو کہ جوں جوں قبیلہ مذکور تہذیب و تمدن میں ترقی کرتا جائے گا توں توں اس کا سرمایہ بھی مختلف صورتیں اختیار کرتا جائے گا۔

مثال مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ اوّل اوّل ذخیرے کی صورت میں ظاہر ہوا کیونکہ کشتی بنانے والے کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ پہلے ایام کشتی گری کے لیے اپنی خورد و نوش کا سامان مہیا کرے۔ اس کے بعد سرمایہ کشتی گری کے اوزاروں کی صورت اور بالآخر اس مصالح کی صورت میں جس سے کشتیاں تیار ہوتی ہیں، منتقل ہو گیا۔ غرض کہ ہم مختصر طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی قوم کا سرمایہ اس قوم کی دولت کا وہ حصہ ہے جو دولت کی نئی نئی صورتیں پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور جس کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقہ پر ہو سکتی ہے:

۱۔ وہ سرمایہ جو مزید دولت کی پیدائش کے ایام میں سرمایہ داروں اور محنتیوں کی خورد و نوش میں صرف ہو۔

۲۔ اوزار یعنی مختلف پیشوں کے ہتھیار، آلات اور کلیں وغیرہ۔

۳۔ مصالح۔ جس میں دولت کی وہ تمام صورتیں شامل ہیں جو سامان معاش اور اوزاروں کے علاوہ ہوں۔

مقدم الذکر صورت میں اسے سرمایہ دائر کہتے ہیں کیونکہ یہ ایک ہیئت سے منتقل ہو کر دوسری ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ مثلاً محنتیوں کی اُجرت ان کی اشیاء خورد و نوش کی چیزیں قوائے حیات کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ موخر الذکر دو صورتوں میں اسے سرمایہ

قائم کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کیونکہ سرمایہ مذکور ایک مستقل اور غیر متبدل ہیئت اختیار کر لیتا ہے جس سے رفتہ رفتہ مزید دولت پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اگرچہ تہذیب و تمدن کی عام حالتوں میں سرمایہ انھی تین صورتوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن زمانۂ حال کے مہذب ممالک میں اشیاء مادیہ کے علاوہ اعتبار اور حقوق مجردہ مثلاً حق نالش وغیرہ بھی سرمایہ کے طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ زمانۂ حال میں ہزارہا سوداگر اپنے ذاتی اعتبار پر تجارتی اشیاء خرید کرتے اور ان کی فروخت سے نفع اٹھاتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس زمانۂ حال کی تجارت کا بہت بڑا حصہ حقوق نالش اور دیگر حقوق مثلاً حق تصنیف وغیرہ کی خرید و فروخت کے متعلق ہے۔

دنیا میں بہت سے ملک ہیں جن کو قدرت نے صنعت و حرفت اور دستکاری کے دیگر اقسام کے لیے نہایت موزوں پیدا کیا ہے۔ لیکن سرمایے کی کمی یا عدم موجودگی کے باعث ان کی تجارت چمک نہیں سکتی۔ ہمارے ہندوستان کو بھی اس مصیبت کا سامنا ہے۔ یہاں کی تجارت بیشتر مغربی سوداگروں کے ہاتھوں میں ہے جو اپنے سرمایہ کو ہندوستانی تجارت کی مختلف شاخوں میں لگا کر نفع عظیم حاصل کرتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ غیر ملکی سوداگروں کا ہمارے ملک میں سرمایہ لگانا ہمارے لیے مضر ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر سرمایہ ہمارا اپنا ہوتا تو نفع جو اس سے پیدا ہوتا ہے اور جو موجودہ صورت میں غیر ملکی سوداگروں کے ہاتھوں میں جاتا ہے، ہمارے ملک میں ہی رہتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ ان مغربی سوداگروں کے سرمایے کی وساطت سے بالخصوص نیل، غلہ، شکر، کافی اور سونے کی پیدائش کے وسائل پہلے کی نسبت بہت ترقی کر گئے ہیں۔ یا یوں کہو کہ ان لوگوں نے اپنی سرگرمی اور ہمت سے ہماری سرزمین کے مخفی خزائن کے دروازے کھول کر ہمارے لیے آیندہ تجارت کی راہیں کھول دی ہیں۔ بشرطیکہ ہمارے پاس سرمایہ موجود ہو۔ اس بیان سے ظاہر ہے کہ سرمایہ کسی ملک کے وسائل پیدائش کی ترقی، دستکاری اور تجارت کی مختلف شاخوں کے قیام کے لیے کہاں تک ضروری ہے۔ لہٰذا ہمیں یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کون کون سے اسباب ہیں جن سے یہ زیادہ ہو سکتا ہے۔

۱- یہ بیان ہو چکا ہے کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور سرمایہ دار کی کفایت شعاری پر دلالت کرتا ہے۔ لہٰذا تعلیم یا دیگر حالات جو کسی ملک کے لوگوں کو کفایت شعار بنانے کے ممد ہیں، سرمایے کی زیادتی کا پہلا سبب ہیں۔ دولت بچانے کی خواہش لوگوں کے حقوق کی حفاظت اور شرح سود کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ البتہ جو قومیں سود لینا خلاف مذہب تصور کرتی ہیں، ان پر یہ محرک اثر نہیں کر سکتا۔

۲- پیداوار دولت کی مقدار کے زیادہ ہونے سے بھی سرمایہ کی مقدار بڑھتی ہے۔ اگر کسی ملک میں چالیس ہزار من غلہ پیدا ہوتا ہے اور اس میں سے دس ہزار من بطور سرمایہ جمع کر لیا جاتا ہے، تو ظاہر ہے کہ ساٹھ ہزار من غلہ پیدا ہونے کی صورت میں زیادہ مقدار بطور سرمایہ جمع ہونی ممکن ہو سکے گی۔

۳- تجارت اور تبادلہ سے بھی سرمایے کی مقدار بڑھتی ہے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں پیداوار دولت کی مقدار بڑھتی ہے جس سے (دیکھو مسئلہ نمبر ۲) سرمایے کی مقدار میں زیادتی ہوتی ہے۔

باب چہارم

کسی قوم کی قابلیت پیدائشِ دولت کے لحاظ سے

کسی قوم کی قابلیت پیدائش دولت کے لحاظ سے اس قوم کی زمین، محنت اور سرمایے کے حسن استعمال اور ان کے مفید طریقوں میں صرف ہونے پر انحصار رکھتی ہے۔ خواہ زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو، خواہ پہنچ گئی ہو۔ محنتی کی ہنر مندی، ذہانت، فن زراعت کی ترقی، تنظیم محنت، سرمایے کو زیادہ دور اندیشی سے نئی نئی مفید صورتوں میں صرف کرنے اور اسی قسم کے دیگر اسباب سے دولت کی پیداوار انتہا درجے کی ترقی کرتی ہے۔ یہاں ایک بڑا ضروری اور اہم اقتصادی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پیداوار دولت زمین، محنت اور سرمایے کی قوتِ پیداوار سے متعین ہوتی ہے، تو کیا وجہ ہے کہ کوئی قوم اس قدر دولت پیدا نہیں کر سکتی جو اُس کے وسائلِ پیدائش کے مطابق ہو؟ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ وسائل پیدائش میں خواہ کسی قدر قوت ہو دولت کی پیداوار اس قوت کے لحاظ سے کم رہتی ہے۔ یعنی اس قدر پیدا نہیں ہوتی جس قدر کہ ہونی چاہیے۔ اس اختلاف کا باعث کیا ہے؟

اس سوال کا جواب علم الاقتصاد کے تمام حصص کے مطالعہ کے بغیر محال ہے۔ دولت کے صرف یا استعمال کے بیان میں تمھیں معلوم ہو گا کہ بعض دفعہ دولت کا استعمال قوم کی قوتِ سرمایہ اور محنت کو انتہا درجے کا نقصان پہنچا دیتا ہے۔ اسی طرح تقسیم دولت کے بیان میں تم معلوم کرو گے کہ بعض دفعہ دولت اپنے پیدا کنندوں کے درمیان ایسے بے اصول طور پر تقسیم ہوتی ہے کہ بعض افراد کو ایک مستقل نقصان پہنچ جاتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس تبادلے کے باب میں اس امر کے اسباب واضح ہوں گے کہ بعض دفعہ پیدائشِ دولت کیوں رُک جاتی ہے یا دستکاری کی چلتی گاڑی میں کیوں روڑا اٹک جاتا ہے جس سے پچھلے سالوں کی پیدا کردہ دولت ان بے کاری کے دنوں میں صرف ہو جاتی ہے۔ لہٰذا مندرجہ بالا سوال کا شافی جواب

اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک تم علم الاقتصاد کے تمام حصص کا غور سے مطالعہ نہ کر لو۔ یہاں ہم صرف اُن اسباب کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، جو پیدائش دولت کے سدّراہ ہیں جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس امر کا ایک سبب تو یہ ہے کہ قدرتی طور پر زمین کی زرخیزی (بشرطیکہ انسان اپنی عقلمندی کے زور سے قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ نہ کرتا رہے) دن بدن کمی کی طرف میلان رکھتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی اسباب ہیں جو ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱- محنت اور سرمایہ کسی حد تک ناقابل انتقال ہیں۔ تمام مہذب قوموں میں محنت اور سرمایہ دونوں کچھ اس طرح خاص خاص صورتیں اختیار کر لیتے ہیں کہ اگر اُن کو ایک صورت سے دوسری صورت میں منتقل کرنا چاہیں تو کئی قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ مثلاً جس تاجر نے لاکھوں روپیہ کی رقم کلوں پر صرف کر دی اُس کے واسطے یہ امر کس طرح ممکن ہے کہ اپنا کثیر سرمایہ بغیر خرچ اور دیگر نقصان کے کسی اور صورت میں منتقل کر دے یا جس دستکار نے ایک خاص پیشہ بڑی جانفشانی سے اور روپیہ خرچ کر کے سیکھا ہے۔ اس کے واسطے کس طرح ممکن ہے کہ اُس پیشے کو چھوڑ کر کسی اور پیشے کو اپنا ذریعۂ معاش بنائے؟

۲- محنت اور سرمایے کا ناعاقبت اندیشی سے استعمال کیا جانا۔ اگر ان ہر دو وسائل کو دور اندیشی سے استعمال نہ کیا جائے تو ان کی قوت پیدائش میں ایک نمایاں فرق محسوس ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کارخانے کے مالک کی وفات پر اس کا جانشین اپنی خامی اور ناتجربہ کاری کے باعث دور اندیشی سے کام نہ لے اور اس طرح اس کی بدانتظامی کی وجہ سے وسائل مذکور کی قوتِ پیدائش میں ایک معتدبہ کمی پیدا ہو جائے۔ تم کو معلوم ہے کہ موجودہ زمانے میں ضروریات کے تقاضے سے تمام مہذب ملکوں میں محنت اور سرمایے کا انتظام افراد کی ایک خاص جماعت کے ہاتھوں میں ہے جس کو جماعت مالکان یا کارخانہ داراں کہتے ہیں۔ اس جماعت کا وجود سرمایے اور محنت کے مفید انتظام کے

لیے ایسا ہی ضروری ہے جیسے فوج کے لیے اعلیٰ افسروں کا وجود۔ جس قدر اصول انقسام محنت پر زیادہ عمل ہوتا جاتا ہے اسی قدر مالک یا کارخانہ دار کا وجود نہ صرف تنظیم، محنت اور دستکاری کو مفید راہوں میں لگانے کے لیے بلکہ دستکاروں کے درمیان حسن انتظام قائم رکھنے کے لیے زیادہ ضروری ہوتا جاتا ہے۔ مالک کے سوا اس امر کا فیصلہ کون کر سکتا ہے کہ کون سی شے تیار کی جائے گی۔ اور کس قیمت پر فروخت کی جائے گی؟ غرض کہ دنیا کی موجودہ دستکاری اس بات کی طرف میلان رکھتی ہے کہ اس کا انتظام دن بدن ایک خاص جماعتِ افراد کے ہاتھوں میں آتا جائے۔

بعض ماہرین علم الاقتصاد کی رائے ہے کہ پیدائش دولت کے نظام میں مالک یا کارخانہ دار کا وجود ضروری نہیں ہے، بلکہ ان حکماء کے خیال میں اس کی موجودگی دستکاروں اور کارخانہ داروں کے درمیان ایک قسم کی بے جا تجارتی رقابت پیدا کر دیتی ہے جس کے نتائج پیدائش دولت کے حق میں مضرت رساں ہوتے ہیں۔ اس دقت کے رفع کرنے کی کئی راہیں بتائی گئی ہیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ ایک ہی پیشے کے دستکار مشترک سرمایے سے مل کر کام کیا کریں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قسم کی باہمی معاونت کئی حیثیتوں سے مفید ہے۔ مثلاً اگر یہ معرض عمل میں لایا جاوے تو

۱- دولت کی وہ مقدار جو موجودہ اقتصادی حالات میں مالک کی جیب میں جاتی ہے، دستکاروں کے قبضے میں آئے گی۔

۲- دستکار ہر طرح سے خود مختار ہو گا اور دولت کی جو صورت چاہے گا پیدا کرے گا۔

۳- موجودہ حالات تمدن میں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دستکار مالکوں سے زیادہ اجرت لینے پر ضد کرتے ہیں اور اگر ان کو اجرت کی مطلوبہ مقدار نہ ملے تو کام کاج چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن اگر اس طریق کو عمل میں لایا جاوے تو ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ کیونکہ جس فریق سے ضد پیدا ہو جانے کا امکان ہے وہ فریق ہی نہ رہے گا۔

۴- دستکار کو کفایت شعاری کی تحریک ہو گی اور اپنا کام تندہی سے کرے گا۔ یہ طریق معاونت عملاً دو صورتیں اختیار کر سکتا ہے:

اول- وہ صورت جس میں دستکار متحد ہو کر کسی خاص تجارتی شاخ میں آمدنی پیدا کرنے کی غرض سے کام کریں۔

دوم- وہ صورت جس میں دستکار اپنی حاصل کردہ دولت باحسن وجوہ صرف کر سکیں۔ مثلاً چند دستکار مل کر کھانے پینے کی چیزوں کی ایک دکان کھولیں اور آپس میں یہ عہد کر لیں کہ وہ اپنی ضرورت کی چیزیں معمولی منافع پر اسی دکان سے خرید کیا کریں گے۔ اس طریق سے ایک تو یہ فائدہ ہو گا کہ ضرورت کی چیزیں کسی قدر سستی مل جایا کریں گی اور علاوہ اس کے مصارفِ دکان وغیرہ نکال کر جو سال بھر کے بعد منافع ہو گا، وہ سب دستکاروں پر ہر ایک کے حصے کے مطابق تقسیم ہو جایا کرے گا۔ مقدم الذکر صورت میں کچھ بہت بڑی کامیابی کی امید نہیں ہو سکتی، کیونکہ دستکار متحد ہو کر وہ تجارتی قابلیت نہیں دکھاتے، جو کارخانہ داروں میں بالخصوص پائی جاتی ہے۔ اُن میں سے اکثر صرف کل کی طرح کام کرنا جانتے ہیں اور اس تجارتی مذاق سے قطعاً معرا ہوتے ہیں، جس کے ذریعے سے کارخانہ دار تجارت کے جذر و مد کو ایک نگاہ سے معلوم کر لیتے ہیں، البتہ مؤخر الذکر میں کامیابی کی امید ہو سکتی ہے۔ خصوصاً ہندوستان میں جہاں اس قسم کے اتحاد کی سخت ضرورت ہے۔

سوم- اس مختصر سے گریز کے بعد جاننا چاہیے کہ پیدائش دولت کا تیسرا مانع بعض قدرتی حوادث سے دولت کا برباد ہو جانا ہے۔ مثلاً آندھی کے طوفان سے جہازوں کی تباہی، آتش زدگی اور ریل کے دیگر حادثات وغیرہ۔

اس باب کے ضمن میں ایک اور ضروری مسئلے کی تحقیق بھی لازم ہے۔ تم جانتے ہو کہ مختلف ممالک میں پیداوار دولت کی مقدار مختلف ہوتی ہے بلکہ اگر ایک ہی ملک کی تاریخ پر نظر ڈالو تو معلوم ہو گا کہ مختلف زمانوں میں اس ملک کی پیداوار دولت کی مقدار مختلف رہی ہے۔ بسا اوقات دو ملک تہذیب و تمدن کے ایک ہی درجے پر ہوتے ہیں اور ان کے دیگر

حالات بھی قریباً قریباً یکساں ہوتے ہیں۔ تاہم مذکورہ بالا اختلاف اس صورت میں بھی موجود ہوتا ہے۔ اس واقعہ پر غور کرنے سے دو ضروری سوال پیدا ہوتے ہیں:

ا- وہ کون سے اسباب ہیں جن سے یہ اختلاف پیدا ہوتا ہے؟

۲- یہ اسباب کون سے اقتصادی قوانین کے تابع ہو کر عمل کرتے ہیں؟

پیدائش دولت ایک پیچیدہ عمل ہے جس کے بالعموم تین مدارج ہوسکتے ہیں:

الف- وہ محنت جو کسی مادی شے پر قبضہ حاصل کرنے میں عارض ہوتی ہے۔ مثلاً جنگل سے درختوں کا کاٹنا۔

ب- وہ محنت جو اُس قدرتی شے میں ایسے تغیرات پیدا کرنے پر صرف ہوتی ہے جو اس کو انسانی استعمال کے قابل کر دیتے ہیں۔ مثلاً لکڑی کی چوکیاں تیار کرنا۔

ج- وہ محنت جو مصنوعات کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر لے جانے میں صرف ہوتی ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ جس ملک میں محنت نسبتاً زیادہ مساعد حالات میں صرف کی جائے گی یا جہاں محنتیوں کی تعداد یا ان کی محنت کی کارکردگی زیادہ ہوگی وہاں پیدائش دولت کا عمل نہایت نتیجہ خیز ہوگا۔ مختلف ممالک کا مقابلہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

ا- بعض ممالک میں محنت کے واسطے حالات نسبتاً زیادہ مساعد ہوتے ہیں۔ مثلاً کہیں قدرت نے اپنی فیاضی سے کوئلے کی وسیع کانیں رکھ دی ہیں اور کہیں مفید دھاتوں کے بیش بہا خزانے زمین کے اندر پوشیدہ کر دیے ہیں۔ علیٰ ہذاالقیاس بعض ممالک میں کئی اشیاء قدرتی پیدا ہوتی ہیں۔ حالانکہ دیگر ممالک انھی اشیاء کو محنت شاقہ سے حاصل کرتے ہیں۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے فوائد ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ مغلوں کے زمانے میں دریاؤں کا ایک فائدہ اور فائدوں کے علاوہ یہ بھی تھا کہ مختلف شہروں اور قصبوں میں تجارتی اور دیگر تعلقات کا سلسلہ انھی کی وساطت سے جاری تھا۔ ہمارے زمانے میں یہ سب کام ریل گاڑی کی وساطت سے سرانجام پاتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ قدرت کے مختصر خزائن سے ہم صرف اسی

صورت میں مستفید ہو سکتے ہیں کہ ہم کو ان کا علم ہو۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ اشیاء مادیہ کے مخفی خواص اور زمین کے پوشیدہ اسرار روز بروز زیادہ معلوم ہوتے جاتے ہیں اور انسان اُن سے مستفید ہو کر بے انتہا فائدہ اٹھاتا جاتا ہے۔ جن قوموں کو یہ علم نہیں، ضرور ہے کہ وہ پیدائش دولت میں اُن اقوام سے پیچھے ہوں جن کو ان اسرار کا علم ہے۔ معدنیات کو ہی لو۔ جس ملک کے لوگوں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ معدنیات کس طرح دریافت ہوا کرتی ہیں ان کو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا، خواہ ان کے ملک کی زمین قیمتی دھاتوں کے خزانوں سے معمور ہو۔

۲۔ بعض ممالک میں دستکاروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے جو پیدائش دولت پر ایک نمایاں اثر ڈالتی ہے۔ ہمارے ہندوستان میں دستکاروں کی تعداد کثیر ہے۔ صرف سرمایے کی کسر ہے ورنہ پیدائش دولت میں ہم اور قوموں سے اس قدر پیچھے نہ ہوتے۔ کمیت کے علاوہ مختلف ممالک کے دستکاروں کی کیفیت بھی مختلف ہوتی ہے۔ بعض ممالک کے دستکاروں کی عادات جبلی طور پر قوانین صحت کے خلاف ہوتی ہیں۔ کہیں پانی اور صاف ہوا دستیاب نہیں ہو سکتی۔ کہیں اور اس قسم کے طبعی اسباب ہوتے ہیں جن سے دستکاری کی کیفیت پر اثر پڑتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جسمانی قوت کے اختلاف کے علاوہ مختلف مقامات کے دستکاروں کے ہنر، سمجھ اور دور اندیشی میں بھی فرق ہوتا ہے۔ بعض اقوام قدرتاً دیگر اقوام کی نسبت زیادہ ذکی اور چُست ہوتی ہیں، بعض قدرتاً سُست اور آرام طلب۔ اس قسم کے نقائص کا دور کرنا ملک کے مصلحوں اور معلموں کا فرض ہے۔

۳۔ محنت کے محرکات میں بھی بالعموم اختلاف ہوتا ہے۔ فطرتاً ہر انسان دولت کا خواہشمند ہے اور یہ فطری خواہش محنت کا سب سے بڑا محرک ہے۔ لیکن بعض اوقات دیگر محرکات زیادہ زبردست ثابت ہوتے ہیں اور دولت کی خواہش کو انسان کی زندگی پر پورا پورا اثر کرنے سے روکتے ہیں۔ بعض مذاہب میں دولت کی تحقیر ایک مسلم اصول ہے، جو ضرور ہے کہ ان مذاہب کے مخلص پیرووں پر اپنا اثر کرے۔ بالعموم مشرقی

اقوام کے لوگ تقدیر کے اس قدر قائل ہیں کہ کل کی فکر کرنا جانتے ہی نہیں اور توکل کے بھروسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ دولت کی خواہش ایک خاص حد تک ہی محرکِ محنت ہو سکتی ہے۔ کیونکہ محنت سے اصل مدعا یہی ہوتا ہے کہ تمام ضروریات پوری ہو جائیں۔ جب تمام ضروریات پوری ہو گئیں تو پھر یہ محرک اپنا عمل نہیں کر سکتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب انسان کی ضروری حاجات پوری ہو جاتی ہیں، تو قدرتاً جدید ضروریات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً مکان کو آراستہ کرنے اور دیگر آسائش کے سامان کی خواہش۔ علم وادب اور دیگر علمی مشاغل سے لذت اٹھانے کی خواہش بھی اسی ضمن میں شامل ہے۔ یہ محرکات ثانی ہیں جو مختلف اقوام کی حالت میں اور تہذیب و تمدن کے مختلف مدارج میں مختلف طور پر اپنا اثر کرتے ہیں۔ اسی طرح ذاتی ضروریات کے پورا ہونے پر قدرتاً ہر انسان کو اولاد کے لیے کچھ نہ کچھ پیچھے چھوڑ جانے کا بھی خیال پیدا ہوتا ہے جو محنت کا ایک مزید محرک ہے۔

۴- مختلف ممالک کے دستکاروں کے اخلاقی حالات مختلف ہوتے ہیں۔ دستکار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دیانت دار ہو۔ کام چور نہ ہو اور اپنی طبیعت کے غیر نافع جذبات پر قدرت رکھتا ہو۔ جس قدر عاقبت اندیشی اور دیانت داری اس میں ہو گی، جس قدر اپنے مقررہ فرض کی انجام دہی کا خیال اس میں ہو گا۔ اس قدر اس کی محنت قومی دولت کو زیادہ کرے گی۔ سُست اور آرام طلب دستکار اپنے ملک اور قوم کے لیے ایک مضرت رساں وجود ہے۔ کیونکہ اس کا وجود قوم کی دولت کو دن بدن گھٹاتا ہے۔ تعلیم و تربیت کا سب سے ضروری فرض یہی ہے کہ عوام میں دیانت داری، چستی، عاقبت اندیشی اور دیگر ضروری اوصاف پیدا ہوں اور ان کے دلوں پر یہ بات نقش ہو جائے کہ تمام قوم کا فائدہ بحیثیت مجموعی اور کسی خاص فرد قوم کا فائدہ متغائر چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں اور جو دستکار اپنے حیوانی جذبات کی پیروی کر کے

اپنے جسمانی اور روحانی قویٰ کو نقصان پہنچاتا ہے، وہ نہ صرف اپنی ذات پر بلکہ اپنے ملک اور قوم پر بھی ظلم کرتا ہے۔

۵- مختلف ممالک میں دستکاروں کی محنت کی کارکردگی مختلف ہوتی ہے اور اکثر ممالک میں اس کارکردگی کو زیادہ کرنے اور سرمایے کے زیادہ دور اندیشی سے استعمال کیے جانے کے وسائل اختیار کیے گئے ہیں۔ کہیں طریق اشتراک مروج ہے کہیں طریق معاونت (جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) سے کام لیا جاتا ہے اور کہیں دیگر اقسام کے تجارتی اتحاد پر عمل کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہندوستان میں بھی طریق اشتراک یعنی مشترک سرمایے سے کام کرنا اب مروج ہوتا جاتا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ طریق ان ممالک کے لیے نہایت مفید ہے جہاں مجموعی طور پر سرمایے کی مقدار کم ہو۔ اگر کوئی شخص سو روپیہ سرمایے کے ساتھ کوئی تجارت شروع کرے تو اس کو کچھ بہت منافع کی توقع نہ ہو گی۔ لیکن سو سو روپیہ سرمایے والے بیس آدمی مل کر کام شروع کریں تو بہت زیادہ منافع کی امید ہو گی۔ یہ اسباب اختلاف مختلف ممالک میں یا تو حقیقتاً موجود ہیں اور اپنا عمل کر رہے ہیں یا حقیقتاً موجود تو ہیں لیکن ان کا اثر دیگر اسباب کے عمل سے زائل ہو رہا ہے۔

ہم نے اپنے پہلے سوال کا جواب دے دیا ہے۔ اب ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مندرجہ بالا اسباب اختلاف کون سے اقتصادی قوانین کے تابع ہو کر عمل کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان اسباب میں سے بعض مثلاً سبب نمبر ا کا عمل کسی قانون کلیہ کے تابع نہیں ہے تاہم بعض کا عمل قوانین کے تابع ہے۔ مثلاً دستکاروں کی تعداد اور اُس کے متعلقہ اسباب کا عمل قانون کلیہ آبادی کے تحت میں ہے اور علیٰ ہذا القیاس محنت کی کارکردگی وغیرہ کا عمل قانون سرمایہ کے احاطۂ اثر میں داخل ہے۔ ماہرین علم الاقتصاد نے اس بارے میں تین کلیہ قوانین دریافت کیے ہیں جن کو ہم سلسلہ وار بیان کرتے ہیں۔

۱- قانون آبادی

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی قوم کے افراد کے زیادہ ہونے سے اس قوم کے دستکاروں کی تعداد بڑھتی ہے۔ مگر اس وقت یہ امر محل بحث نہیں ہے۔ ہم قانون آبادی پر اس تعلق کے لحاظ سے نگاہ ڈالنا چاہتے ہیں جو افزائشِ افراد اور پیداوارِ دولت کے درمیان ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ یہ قانون تین قضایا پر منقسم ہو سکتا ہے۔

اوّل- یہ کہ آبادی ہمیشہ بڑھنے کا میلان رکھتی ہے اور اس کی افزائش اس امر کا خیال نہیں کرتی کہ آیا مزید آبادی کے گزارے کے لیے کافی سامان معیشت موجود ہو گا یا نہیں۔ بعض حکماء نے تخمینہ لگایا ہے کہ اگر بڑے بڑے قحط اور وبائیں نہ آئیں تو آبادی تیس سال میں دوگنی ہو جائے گی۔

دوم- اگر زمین کے کسی قطعہ میں آبادی اس طرح دُگنی، تگنی ہوتی جائے اور دیگر اسباب اس کی افزائش کے سدراہ نہ ہوں (مثلاً وبا، قحط، جنگ اور شادیوں کی کمی وغیرہ) تو ایک خاص میعاد کے بعد قطعہ مذکور کی پیداوار وہاں کے آدمیوں کے لیے مشکل سے کافی ہو گی اور بالآخر مطلق کفایت نہ کرے گی یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ آبادی کی مفروضہ افزائش کا سلسلہ جاری نہیں رہ سکے گا۔

سوم- ہمارا گذشتہ تجربہ جو ہم کو صنعت و حرفت کی ترقی کا مشاہدہ کرنے سے حاصل ہوا ہے، اس امر کی تصدیق نہیں کر سکتا کہ فن زراعت کی آئندہ ترقی سے ہم اپنی آبادی کی مفروضہ افزائش کے مطابق خوراک کی زیادہ مقدار پیدا کر سکیں گے۔

قضیہ نمبر ۲ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون تقلیل حاصل بھی جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں قانون آبادی کے ساتھ گہرا تعلق رکھتا ہے اور ان دونوں کے اجتماع سے یہ نتیجہ قائم ہوتا ہے کہ آبادی کے ایک خاص حد تک بڑھ جانے کے بعد زرعی دستکاروں کی مزید آبادی سے محنت کی قابلیت پیداوار کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جس قدر آبادی زیادہ ہو گی اور ایک حد معین سے بڑھتی جائے گی (یہ حد معین مختلف ممالک کی صورت میں مختلف ہو سکتی ہے کیونکہ مختلف اقوام و ممالک میں صنعت و حرفت و فن

زراعت اور دیگر ایجادات کی ترقی کے مدارج مختلف ہیں۔ مثلاً ممکن ہے کہ ایک چھوٹا سا ملک اپنے ایجادات زرعی کے بل پر ۲۰ کروڑ آبادی کا متحمل ہو سکے اور ایک اور ملک جو اس سے وسعت میں بہت زیادہ ہو لیکن ایجادات میں کم ہو اُس سے آدھی آبادی کا بھی متحمل نہ ہو سکے) اسی قدر زمین مزروعہ کی کاشت نقطۂ تقلیل تک جلد پہنچے گی جس کا نتیجہ جو کچھ پیداوار دولت پر ہو گا ظاہر ہے۔

۲۔ محنت کی کارکردگی

محنت کی کارکردگی کے اختلافات اور ان کے اثر کے متعلق کوئی کلیہ قانون وضع نہیں ہو سکتا کیونکہ دستکاروں کے طبعی، عقلی اور اخلاقی اوصاف کے فرق بیان کرنے اور ان کے محرکات محنت کی تشریح کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم کو تہذیب و تمدن کے خفی در خفی اسباب کا پورا پورا علم ہو، جو موجودہ صورت میں ناممکن ہے۔ لہٰذا ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مختلف ممالک کے درمیان مختلف افراد کے ذاتی سرمایے کی افزائش جس پر پیداوار دولت کا ایک حد تک انحصار ہے کس قانون کے تحت میں ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ قانون افزائش سرمایۂ شخصی کیا ہے؟ اس امر کے متعلق محقق مل ایک قانون وضع کرتا ہے کہ سرمایہ جمع کرنے کی خواہش شرح سود کے ساتھ نسبتِ مستقیم رکھتی ہے۔ جس ملک میں شرح سود زیادہ ہو گی وہاں کے لوگوں کو روپیہ جمع کرنے کی تحریک زیادہ ہو گی اور جہاں شرح سود کم ہو گی وہاں جمع کی تحریک مطلق نہ ہو گی یا نہایت کم ہو گی۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مل کا یہ قانون کامل طور پر صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جمع کرنے کی تحریک صرف شرح سود کی مقدار سے ہی نہیں ہوتی، بلکہ اس کے اور بھی کئی ایک اسباب ہیں۔ بلکہ بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ شرح سود کے کم ہو جانے سے جمع کرنے کی تحریک زیادہ ہو جاتی ہے۔ کیونکہ شرح مذکور کی کمی کی صورت میں ضروری ہے کہ زیادہ رقم بطور سود لینے کی غرض سے زیادہ سرمایہ دیا جائے جس کا پہلے جمع ہونا لازم ہے۔

۳- قانون سرمایہ

قانون سرمایہ شخصی تو کسی قدر وضاحت سے بیان ہو سکتا ہے لیکن قانون سرمایہ قومی (سرمایہ قومی سے مراد پیدائشِ دولت کے وہ وسائل ہیں جو کسی قوم کی گذشتہ محنت سے پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً پرانے تعمیر شدہ مکانات، سڑکیں وغیرہ) کا وضاحت کے ساتھ بیان کرنا بہت مشکل ہے۔ کسی فرد واحد کی نسبت تو ہم کسی قدر رائے لگا سکتے ہیں کہ اس کا سرمایہ کس اصول کے مطابق کم و بیش ہوتا ہے مگر کسی قوم کے سرمایے کی نسبت بحیثیت مجموعی اس قسم کا قانون وضع کرنا نہایت دشوار ہے۔ ظاہر ہے کہ سرمایہ قومی کی زیادتی سے محنت کی مانگ یا یوں کہو کہ اجرت کی مقدار بڑھتی ہے اور اس طرح مختلف ممالک کی پیداوار دولت میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ سرمایہ مذکور کا اصل اصول کیا ہے۔ اگر کسی طرح سے کوئی اصول معلوم بھی ہو جائے تو اس سے صحیح نتائج مستخرج نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ بسا اوقات اور بالخصوص زمانۂ حال میں اکثر قومیں اپنا سرمایہ خود نہیں استعمال کرتیں بلکہ دیگر اقوام کو مستعار دے دیتی ہیں۔ اگرچہ سرمایے کو اس طرح پر مستعار دے دینے سے اُن اقوام کو دنیا کی پیداوار محنت میں زیادہ حصہ ملتا ہے۔ لیکن اس سے اُن قوموں کی ذاتی محنت کی قابلیت پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ سوائے اس کے کہ ان کی تجارتِ خارجی کے فوائد میں کسی قدر زیادتی ضرور ہو جاتی ہے۔ مزید برآں اکثر اوقات بعض ممالک کے ارکانِ سلطنت جنگ وغیرہ کے اغراض کے لیے قوم سے قرض اُٹھاتے ہیں، جس سے قومی سرمایے میں کمی عارض ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس رفاہ عام مثلاً تعلیم و حفظان صحت وغیرہ کے کاموں پر جو محنت صرف ہوتی ہے اُس سے کسی خاص فرد کو کوئی نفع نہیں ہوتا بلکہ اُن کا فائدہ عام بلا خصوصیت ہوتا ہے۔ نیز وہ محنت جو اکثر افراد حب وطن کے خیال سے نظام سلطنت کی حفاظت اور اس کی اندرونی قوت کو برقرار رکھنے کے لیے کرتے ہیں اکثر مالی فائدہ کی آمیزش سے معرا ہوتی ہے۔ غرض کہ ان وجوہ سے کسی ملک کے سرمایہ قومی کی کمی بیشی کا کوئی وسیع اور کامل اصول قائم کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

حصہ سوم

تبادلۂ دولت

باب اوّل

مسئلہ قدر

بعض مصنفین کہتے ہیں کہ تبادلۂ دولت علم الاقتصاد کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے۔ مگر یہ رائے تجارت اور تبادلے میں امتیاز نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے منطقی وضاحت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس مضمون کو علم الاقتصاد کا ایک علیحدہ حصہ سمجھا جائے تاکہ مختلف اقتصادی مسائل آپس میں مخلوط نہ ہو جائیں۔ اس حصے کا مقصد تناسب تبادلہ یا ان شرائط پر بحث کرنا ہے جن کی رو سے ایسی اشیاء کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے جو ایک معین قدر رکھتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب دو چیزوں کا تبادلہ کیا جاتا ہے تو ایک شے کی ایک خاص معین مقدار دوسری شے کی ایک خاص معین مقدار کے عوض میں دی جاتی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقدار معین کیوں ہوتی ہے، کم و بیش کیوں نہیں ہوتی؟ علم الاقتصاد کے اس حصے کا مقصد اسی سوال کا جواب دینا ہے۔

تبادلہ انقسام محنت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہر شخص اپنی اپنی ضرورت کی چیزیں پیدا کرنے میں مصروف ہوتا تو تبادلے کی ضرورت کبھی لاحق نہ ہوتی۔ لیکن جب ان کے مشاغل میں اختلاف پیدا ہوتا ہے یا یوں کہو کہ مختلف انسان یا اقوام دولت کی مختلف صورتوں کے پیدا کرنے میں مصروف ہوتی ہیں، تو تبادلے کا دستور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ مختصر طور پر یوں کہو کہ تبادلہ اتحاد کی ایک صورت ہے جو اختلاف مشاغل سے پیدا ہوتی ہے۔ جب ایک شخص غلہ پیدا کرتا ہے، دوسرا مکئی یا آلو اور تیسرا کپڑا تیار کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ ضرورت ان سب کو باہمی تبادلے پر مجبور کرے گی۔ اس وقت یہ سوال پیدا ہوگا کہ غلہ کی کس قدر مقدار دس گز کپڑے یا دو من آلو کے عوض دی جائے گی؟ جس قدر اصول انقسام محنت کا عمل وسیع ہوتا جائے گا اسی قدر تبادلے کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جائے گا۔ لیکن چونکہ ایسی صورت میں

افراد کو اپنی اپنی ضرورت کی اشیاء کا باہمی تبادلہ کرنے میں دقت ہوگی یا کم از کم ان کے وقت کا کچھ حصہ اس تبادلے میں ضائع ہوگا، اس واسطے قدرتاً تبادلے کا کام افراد کی ایک خاص جماعت کے زیر اہتمام آتا جائے گا۔ جس کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں افراد تبادلہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن کی وساطت سے تجارت عالَم کی گاڑی چلتی ہے اور دور دراز ممالک کے باشندوں کے درمیان رابطۂ اتحاد پیدا ہوتا ہے اور تبادلۂ اشیاء کے ساتھ تبادلۂ خیالات بھی ہوتا رہتا ہے۔

غرض ہمارا مقصد اس حصے میں یہ معلوم کرنا ہے کہ تبادلے میں اشیاء کی خاص خاص مقادیر کن اصولوں کے لحاظ سے متعین ہوتی ہیں۔ کیا وجہ ہے کہ ہندوستانی غلے کی ایک خاص مقدار کے عوض میں چینی چائے کی ایک خاص مقدار یا جاپانی چھاتوں کی ایک خاص تعداد دی جاوے؟ یہ مقدار یا یہ تعداد کم و بیش کیوں نہ ہو؟ مختصراً اشیاء میں قوت تبادلہ کن کن شرائط سے پیدا ہوتی ہے؟ اور اس کے اسباب و وجوہ کیا کیا ہیں؟

قدر کی تعریف اس کتاب کے پہلے حصہ میں لکھی جا چکی ہے۔ یعنی قدر قوت تبادلہ کا نام ہے یا اس قدر و قوت کا نام ہے جو کسی شے کی وساطت سے اس شے کے قابض کو حاصل ہوتی ہے اور جس کو تبادلے میں دے کر وہ شخص بلا لحاظ جبر و اکراہ یا تاثرات ذاتی اوروں کی پیداوار محنت کو حاصل کر سکتا ہے مگر سوال یہ ہے کہ کیوں ایک شے اپنے قابض کو یہ قدرت یا قوت دیتی ہے اور دوسری نہیں دیتی؟ کیوں ایک شے کے قبضے سے اوروں کی پیداوار محنت پر ہفتوں مہینوں بلکہ سالوں تک یہ قدرت حاصل رہتی ہے اور دوسری شے کے قبضے سے یہ قدرت مطلق حاصل نہیں ہوتی یا اگر ہوتی ہے تو نہایت قلیل عرصے کے لیے؟ یہ سوال علم الاقتصاد کے نہایت ضروری سوالوں میں سے ہے۔ لہٰذا طالب علم کا فرض ہے کہ اس کے ہر پہلو پر غور کر کے اس کو اچھی طرح سے ذہن نشین کر لے۔

ظاہر ہے کہ تبادلے کے لیے کم از کم دو اشیاء کا ہونا لازم ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ کسی شے کا تبادلہ ہو سکتا ہے تو ہمارا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کا تبادلہ کسی اور شے کے ساتھ ہو سکتا ہے اور جب ہم یہ کہتے ہیں کہ فلاں شے کی قدر تبادلے میں اتنی ہے تو بالواسطہ یا بلاواسطہ ہم

کسی اور شے یا اشیاء کی قدر کی طرف اشارہ کرتے ہیں، جن کے عوض میں شے مذکور دی جا سکتی ہے۔ عام طور پر یہ دوسری شے جس کے عوض میں کوئی شے دی جا سکے زرِ نقد ہے، جس کو دنیا کی مہذب اقوام نے اشیاء کی قدر کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ پس کسی شے کی قدر سے حقیقت میں مراد اس کی قیمت سے یا زرِ نقد کی اس مقدار سے ہے جو اس شے کے عوض میں دی جائے۔ اس مقام پر قدر اور قیمت کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔ لہٰذا ہم اسے واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کے پاس چار من غلہ ہے جس کے عوض میں اسے ۲۷ من کوئلہ مل سکتا ہے۔ اس صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ ۴ من غلے کی قدر ۲۷ من کوئلے کی قدر کے برابر ہے۔ اس مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ قدر کے مفہوم میں اشیاء کا مقابلہ داخل ہے اور قدر ایک اضافی اصطلاح ہے۔ ایک شے کی قدر دو طرح سے کم و بیش ہو سکتی ہے۔ یا تو اس کی ذاتی قدر میں کمی بیشی ہونے سے یا دیگر اشیاء کی قدر میں تغیر پیدا ہو جانے سے۔ پس معلوم ہوا کہ تمام اشیاء کی قدر ایک ہی وقت میں نہیں بڑھ سکتی۔ کیونکہ ایک شے کی قدر کی زیادتی اور دوسرے کی قدر کی کمی لازم و ملزوم ہیں۔ یہ کہنا کہ ایک ہی وقت میں اشیاء کی قدر کم و بیش ہو سکتی ہے ایسا ہی ہے جیسے کوئی کہہ دے کہ چھ شخصوں میں سے ہر ایک اپنے باقی پانچ ہمراہیوں کی نسبت زیادہ تیز رفتار ہے۔ الغرض کسی شے کی قیمت اس کی قدر کی ایک خاص صورت کا نام ہے۔ جب کسی شے کی قدر کا تخمینہ ان قیمتی دھاتوں کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنے سے کیا جائے جو شائستہ اقوام میں بطور معیار قدر مستعمل ہوں، تو کہا جاتا ہے کہ اس شے کی قیمت معلوم ہو گئی ہے۔ گو تمام اشیاء کی قدر ایک ہی وقت میں کم و بیش نہیں ہو سکتی تاہم نہ اُن کی قیمت کا گھٹنا بڑھنا ممکن ہے۔

مندرجہ توضیح سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ مسئلہ قدر حقیقت میں ان اسباب کا دریافت کرنا ہے جن پر اشیا کی قدر ایک معین معیار کے لحاظ سے منحصر ہوتی ہے۔ ان معنوں میں کوئی شے قدر نہیں رکھ سکتی جب کہ اس میں دو خواص نہ ہوں۔ اوّل افادت دوئم دقتِ حصول۔ افادت سے مراد یہ ہے کہ اس شے میں کسی انسانی ضرورت یا خواہش کو پورا کر سکنے کی خاصیت موجود ہے۔ یہ گویا ایک قسم کا امتحان ہے کہ جب تک کوئی شے پہلے اس امتحان میں کامیاب نہ

ہو لے قدر رکھنے والی اشیاء کی فہرست میں داخل نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس فہرست میں کوئی خاص درجہ یا مقام حاصل کرنا اس شے کی دقت حصول پر موقوف ہے۔ پس ظاہر ہے کہ جس قدر کسی شے میں انسانی ضروریات کو پورا کرسکنے کی خاصیت ہو گی اسی قدر اس شے کی قدر بھی زیادہ ہو گی۔ اسی افادت کی کمی بیشی کی وجہ سے اشیاء کی طلب یعنی مانگ میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ جس قدر کسی شے میں افادت زیادہ ہو گی اسی قدر اس کی مانگ بھی زیادہ ہو گی اور جس قدر افادت کم ہو گی اُسی قدر اُس کی مانگ بھی کم ہو گی۔ خریدار ان اشیاء کا معاوضہ زیادہ دیں گے جن کی ان کو ضرورت ہے۔ مگر جن اشیاء کی ان کو ضرورت نہیں ہے، ان کا معاوضہ اوّل تو دیں گے ہی نہیں یا اگر دیں گے تو بہت کم دینے پر راضی ہوں گے۔ بعض محققین علم اقتصاد نے انسانی فطرت کے اس میلان کو ظاہر کرنے کے لیے اصطلاح افادت انتہائی استعمال کی ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اصطلاح مذکور نہایت مفید ہے کیونکہ اس کے استعمال سے تبادلے کی تحریک اور اس کے فوائد کی توضیح ہوتی ہے۔ اس کا مفہوم واضح کرنے کی غرض سے ہم ایک مثال پیش کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ آٹے کا ایک سیر ایک آدمی کی بقائے حیات کے لیے ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ اس ایک سیر میں زیادہ افادت ہو گی۔ لیکن اس شخص کے نزدیک آٹے کے دوسرے اور تیسرے سیر میں وہ افادت نہ ہو گی جو پہلے سیر میں تھی، کیونکہ وہ مقدار اس کی بقائے حیات کے لیے لازم تھی۔ اس مثال میں مقدار تو وہی ایک سیر ہے لیکن ہر سیر کی افادت آٹے کو استعمال کرنے والے کے لحاظ سے مختلف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شخص آٹے کے تیسرے سیر کو اس قیمت پر خریدنا پسند نہیں کرے گا، جس قیمت پر کہ اُس نے پہلے سیر کو خریدا تھا۔ پس کسی کی افادت انتہائی سے مراد اس شے کے آخری یا اختتامی حصے کی افادت سے ہے جس کو مشتری قیمت کی اس کم سے کم مقدار کے عوض میں خرید کرتا ہے، جو اُس شے کا بائع منظور کر سکتا ہے۔ مثال بالا میں آٹے کے تیسرے سیر یعنی اختتامی یا انتہائی حصے کی قیمت اس کی افادت سے متعین ہو گی۔ چونکہ مثال مذکور میں خریدار کو آٹے کے تیسرے سیر کی ضرورت نہیں ہے اس واسطے اوّل تو وہ خریدے گا ہی نہیں اور اگر خریدے گا بھی تو اس بات پر مصر ہو گا کہ قیمت کی کم سے کم مقدار ادا کرے۔ آخر کار

قیمت کی اس کمتر مقدار پر سودا ہو گا جس کو بائع شے منظور کر سکتا ہے۔ اس توضیح سے ظاہر ہے کہ خریداروں کے لحاظ سے اشیاء کی معمولی قیمت ان کی افادت انتہائی سے متعین ہوتی ہے۔ بعض محققین کے نزدیک یہی افادت قدر اشیاء کا اصل اصول ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر شے کی قدر اس شے کی افادت پر منحصر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس شے میں قدر ہو گی اس میں افادت بھی ضرور ہو گی لیکن برعکس صحیح نہیں ہے۔ یہ کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہر مفید شے کوئی خاص قدر بھی رکھتی ہو۔ ہوا پانی وغیرہ مفید اشیاء ہیں، مگر ان کی قدر کچھ نہیں ہے کیونکہ قدرت خود بخود بغیر انسانی کوشش کے ان کو کثرت سے مہیا کر دیتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ہی شے بعض اشخاص کے لیے مفید ہوتی ہے اور بعض کے لیے کچھ فائدہ نہیں رکھتی۔ علیٰ ہذا القیاس بعض اشیاء خاص خاص مقامات میں افادت رکھتی ہیں بعض میں نہیں۔ مزید برآں بعض اشیاء میں مطلق افادت نہیں ہوتی، لیکن ان کی قدر بڑی ہوتی ہے مثلاً ہیرے جواہرات وغیرہ۔ غرض کہ افادت قدر کا ماخذ نہیں قرار دی جا سکتی اس کے لیے ہمیں کوئی اور کلیہ اصول معلوم کرنا چاہیے۔

بعض محققین کی رائے ہے کہ افادت کے علاوہ قدر کے لیے دقت حصول بھی ضروری ہے۔ یعنی ان کے نزدیک شے کا مفید ہونا اور نیز مشکل سے ہاتھ آنا اس کی قدر کا باعث ہوتا ہے۔ اس رائے کو صحیح تسلیم کرنے والے دقت حصول کی تین صورتیں بیان کرتے ہیں۔

۱- اوّل یہ کہ اشیاء کی رسد محدود ہو۔ مثلاً گذشتہ مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں یا دیگر کمیاب چیزیں۔ کیا اس صورت میں اشیاء کی قدر اس محنت پر منحصر ہو گی، جو ابتداءً ان پر صرف ہوئی تھی؟ نہیں؛ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان بالعموم اپنی محنت ایسی اشیاء کے معاوضے میں نہیں دیتا جن پر کچھ محنت نہ صرف ہوئی ہو اور نیز بالآخر مجموعی طور پر اشیاء کی قدر قریباً قریباً اس محنت کے مطابق ہو گی جو ان پر ابتداءً صرف ہوئی تھی۔ تاہم حق یہ ہے کہ کسی شے کی قدر اس امر پر منحصر نہیں ہے کہ اس شے کی تیاری میں ابتداءً کتنی محنت صرف ہوئی تھی بلکہ یہ اس امر پر منحصر ہے کہ وہ شے اب بغیر محنت کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی شاہ نامہ فردوسی کے اپنے ہاتھوں کا لکھا ہوا مل جائے تو اس کی قدر اس محنت کا نتیجہ نہ تصور کرنی چاہیے

جو ابتداءً اس کی تحریر میں صرف ہوئی تھی بلکہ اس کا انحصار اس امر پر ہو گا کہ اکثر لوگوں کو اس نسخہ کی ضرورت ہے اور اب ایسا تیار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ابتدائی محنت بھی کسی شے کی قدر کا ماخذ نہیں قرار دی جا سکتی۔ مندرجہ بالا دلیل کے علاوہ اس دعویٰ کے ثبوت میں ذیل کے دلائل بھی دیے جا سکتے ہیں:

الف- اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے، تو قدر کی کمی بیشی محنت کی کمی بیشی پر منحصر سمجھنی چاہیے۔ مگر یہ بات صریحاً تجربے کے خلاف ہے۔ جس وسیع زمین پر لاہور جیسا عظیم الشان شہر آباد ہے۔ اس کی قدر اندازے سے زیادہ ہے لیکن یہ زمین کسی طرح محنت کا نتیجہ نہیں ہے۔

ب- اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے تو جن دو چیزوں پر مساوی محنت صرف ہوئی ہے، اُن کی قدر بھی مساوی ہونی چاہیے۔ مگر تجربہ اس کے خلاف ہے۔ اگر ایک ٹکڑا سونے اور ایک ٹکڑا لوہے کا، دونوں مساوی محنت سے حاصل ہوں، تو کیا ان کی قدر بھی مساوی ہو گی؟ ہر گز نہیں۔

ج- اگر محنت کو قدر کا اصل باعث سمجھا جائے، تو ہر شے کی قدر اس محنت سے متناسب ہو گی، جو اس شے کے حاصل کرنے میں صرف ہوئی ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ فرض کرو کہ ایک شخص کو خوش قسمتی سے زمین کی سطح پر پڑا ہوا سونے کا ایک ٹکڑا مل جاتا ہے۔ ایک اور شخص کو ایسا ہی ٹکڑا ہفتہ بھر زمین کھود کھود کر ملتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک اور شخص ہے جس کو اس قسم کا ٹکڑا مہینے کی محنت کے بعد ملتا ہے۔ اس اصول کی رو سے چاہیے کہ جس شخص کو مہینے کی محنت کے بعد سونے کا ٹکڑا ملا ہے اس کا سونا اس شخص کے سونے سے بہت زیادہ بیش قیمت ہو جس کو بغیر محنت کے زمین پر پڑا ہوا مل گیا تھا۔

د- اگر محنت کو قدر کا باعث سمجھا جاوے تو جس شے پر محنت صرف کی گئی ہے چاہیے کہ اُس کی قدر دوامی اور مساوی ہو۔ مگر یہ صریحاً غلط ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ ایک ہی شے کی قدر مختلف مقامات میں مختلف ہوتی ہے۔ بلکہ بعض جگہ کئی اشیاء کی قدر کچھ بھی نہیں ہوتی، حالانکہ ان پر محنت بھی صرف کی گئی ہو۔ افریقہ کے وحشیوں کے درمیان ایک سنسکرت

پڑھانے والے پنڈت یا عربی کی تعلیم دینے والے مولوی کا علم کیا قدر رکھ سکتا ہے؟ اگر ہندوستان کے مسلمان ترکی ٹوپیاں پہننا یک قلم ترک کر دیں تو اس اصول کی رو سے ضرور ہے کہ اُن کی قدر بدستور قائم رہے اگرچہ اُن کی مانگ مطلق نہ ہو۔

ر۔ اگر محنت کو قدر کا ماخذ سمجھا جاوے تو محنت کی قدر کا کیا ماخذ ہوگا؟

۲۔ دوسری صورت دقت حصول کی یہ بیان کی جاتی ہے کہ کسی شے کی تیاری میں محنت اور سرمایے کی ضرورت ہو۔ اس ضمن میں جو اشیاء داخل ہیں ان کی قدر یا قیمت ان اشیاء کے مصارفِ پیدائش سے متعین ہوگی۔ یہ غلطی بھی اسی غلطی کا ایک نتیجہ ہے کہ اشیاء کی قدر کا ماخذ محنت ہے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ قدر کا انحصار ابتدائی محنت پر نہیں ہوتا بلکہ یہ اس بات پر موقوف ہے کہ موجودہ حالت میں وہ شے بغیر محنت اور سرمایے کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ بعض کوئلے کی کانوں میں اوپر کے تہوں کا کوئلہ نہایت عمدہ ہوتا ہے اور نیچے کے تہوں کا کوئلہ اچھا نہیں ہوتا، بلکہ اس میں مٹی اور راکھ وغیرہ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اوپر کا کوئلہ نکالنے میں مصارف کی مقدار کم ہوگی اور نیچے کا کوئلہ نکالنے میں چونکہ محنت زیادہ صرف ہوئی ہے، اس واسطے مصارف کی مقدار بھی زیادہ ہوگی۔ لیکن اگرچہ اشیاء کی قدر مصارفِ پیدائش پر منحصر ہے تو چاہیے کہ نیچے کے کوئلے کی قیمت اوپر کے کوئلے کی قیمت سے بہت زیادہ ہو۔

۳۔ تیسری صورت دقّتِ حصول کی یہ ہے کہ بعض اشیاء اس قسم کی ہوتی ہیں جن کو ایک معین میعاد کے اندر تیار کیا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ جن لوگوں کو ان کی ضرورت ہے، وہ اس عرصہ تک انتظار کریں۔ اس صورت میں اشیاء کی قیمت ان مصارف سے متعین ہوتی سمجھی جائے گی جو ان کے از سر نو تیار کرنے میں عائد ہوتے ہوں۔ مگر یہ بات ہمیشہ صحیح نہیں ہوتی کیونکہ ایک نہایت قدیم زمانے کی کل کو ان مصارف سے کوئی نسبت نہیں ہے جو اس کے نئے سرے سے تیار کرنے میں عائد ہوتے ہیں۔ کل تو ویسی تیار ہو سکتی ہے مگر چونکہ یہ پرانی کل آثار قدیمہ میں سے تصور کی جائے گی، اس واسطے اس کی قدر یا قیمت بہت زیادہ ہوگی۔

پس معلوم ہوا کہ اشیاء کی قدر یا قیمت (کیونکہ قیمت بھی قدر ہی کی ایک صورت ہے) افادت محنت ابتدائی یا اُن مصارف پر جو اُن کے از سر نو تیار کرنے میں عائد ہوں، منحصر نہیں ہے۔ اگرچہ یہ تینوں قدر کی عوارضات ضرور ہیں تاہم اس کی ماخذ نہیں قرار دی جا سکتی۔ پھر وہ کون سا کلیہ اصول ہے جس پر اشیاء کی قدر کا دارومدار ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قدرِ اشیاء قانونِ طلب و رسد کے عمل پر انحصار رکھتی ا جس کی توضیح ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

سہولت کے لیے ہم پہلے قانونِ طلب کا مفہوم واضح کریں گے، بعد میں قانونِ رسد کا اور پھر دونوں توضیحات کو یکجا کر کے ایک وسیع قانون قائم کریں گے۔ طلب سے مراد کسی شے کی اس خاص مقدار سے ہے جو کسی خاص قیمت پر خرید کی جائے۔ اس تعریف میں ہم

ا بعض حکماء ریکارڈو، سمتھ و مل وغیرہ کہتے ہیں کہ بعض اشیاء کی قدر تو ان کی طلب و رسد کی درمیانی نسبت پر انحصار رکھتی ہے مگر بعض کی ان کے مصارف پیدائش پر۔ یہی وجہ ہے کہ مل کو اشیاء مادیہ کی تقسیم کرنی پڑی اور ہر قسم کے لیے خاص قوانین وضع کرنے پڑے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ رائے صریحاً غلط ہے کیونکہ جیسا طالب علم کو آگے چل کر معلوم ہو گا یہ ایک غلط اصول پر مبنی ہے۔ "یعنی اشیاء کی قدر اس محنت پر منحصر ہے جو ابتداءً ان کی تیاری میں صرف ہوئی ہو۔" یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ مختلف مقادیر اقتصادیہ کے لیے مختلف قوانین ہوں۔ علم الاقتصاد بھی دیگر علوم طبیعہ کی طرح ہے جس طرح ان علوم میں یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض فطری مظاہر کی توجیہ کے لیے ایک خاص قانون ہو اور بعض کی توجیہ کے لیے کوئی اور مختلف قانون ہو اسی طرح یہ بات علم الاقتصاد میں بھی محال ہے۔
اس میں کچھ شک نہیں کہ اکثر صورتوں میں مقابلہ یا تجارتی رشک کے اثر کی وجہ سے اشیاء کی قیمت ان کے مصارف پیدائش کے قریب قریب آجائے گی اور ریکارڈو کا اصول صحیح معلوم ہو گا۔ لیکن یہ بات ہر حالت میں درست نہیں ہے بعض دفعہ غلط اصول سے بھی واقعات کی توجیہ ہو جایا کرتی ہے لیکن اس توجیہ سے اصول کی صحت کی نسبت رائے قائم کرنا صریحاً قوانین منطق کے خلاف ہے۔ قدیم حکماء کا مذہب تھا کہ اجسام کی حرکت قدر تاً کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ یہاں تک کہ آخر کار بالکل معدوم ہو جاتی ہے۔ اس اصول سے کئی فطری واقعات کی توجیہ ہو سکتی تھی لیکن زمانہ حال کے حکماء نے اس اصول کی صحت کو تسلیم نہیں کیا اگرچہ اس اصول کے نتائج کو انھوں نے مان لیا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک حرکت اجسام قدر تاً کم ہوتے جانے کا میلان نہیں رکھتی بلکہ ہر صورت میں بعض اسباب (مثلاً ہوا کی روک یا رگڑ وغیرہ) ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جو اس حرکت کو روکتے ہیں اور آخر کار اس کو معدوم کر دیتے ہیں۔

نے یہ فرض کر لیا ہے کہ اس مقدار کی قیمت کا ادا کرنے والا حقیقی طور پر اس قیمت کو ادا کر سکنے کی قوت رکھتا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ طلب اور خواہشِ حصول مرادف نہیں تصور کیے جا سکتے۔ کیونکہ ہر شخص ہر شے کے حاصل کرنے کی خواہش کرتا ہے، اگرچہ اشیاء مذکورہ کے خرید کر سکنے کی قوت اس میں نہ ہو۔ اس کے علاوہ تعریف مندرجہ بالا میں الفاظ ''خاص قیمت'' بھی ضروری ہیں۔ کیونکہ قیمت کے تغیر سے شے مطلوب کی مقدار میں بھی تغیر مطلوب ہو گا۔ مقدارِ مطلوب کے تغیر سے جو تغیر قیمت کے ساتھ وابستہ ہے قانون طلب کی توضیح ہوتی ہے۔ یعنی جب کسی شے کی قیمت کم ہو جاتی ہے تو (بشر طیکہ زر نقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضے میں ہے مساوی رہے) اس کی مقدار مطلوب بڑھ جاتی ہے اور برعکس اس کے جب قیمت زیادہ ہو جاتی ہے تو مقدار مطلوب کم ہو جاتی ہے۔ ہم نے کہا ہے ''بشر طیکہ زر نقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضے میں ہے مساوی رہے''۔ اس قید کا ہونا ضروری ہے کیونکہ جوں جوں کسی شخص کے وسائل آمدنی ترقی کریں گے یا یوں کہو کہ جس قدر کوئی شخص زیادہ دولت مند ہوتا جائے گا، اسی قدر اس میں اشیاء کو زیادہ قیمت کے عوض میں خرید کر سکنے کی قوت بڑھتی جائے گی اور جس قدر اس کے وسائل آمدنی کم ہوتے جائیں گے یا جوں جوں وہ رقم جو اُس کے پاس ہے کم ہوتی جائے گی، اسی قدر اس کی قوت خرید بھی کم ہوتی جائے گی۔ اگر پہلی صورت میں وہ ایک شے کو دس روپیہ کے عوض میں خرید کر سکتا تھا تو دوسری صورت میں پانچ روپیہ کو بھی نہ خرید کر سکے گا۔ اگرچہ ضرورت دونوں صورتوں میں ایک سی ہی کیوں نہ ہو۔ پس اس قانون کو مختصراً یوں بیان کر سکتے ہیں کہ اشیاء کی مقدار مطلوب کمیِ قیمت سے بڑھتی ہے اور زیادتیِ قیمت سے کم ہوتی ہے۔ مثلاً اگر چھاتوں کی قیمت بڑھ جائے تو بہت سے خریدار جو پہلے چھاتے استعمال کیا کرتے تھے اب ان کا استعمال ترک کر دیں گے۔ اور صرف وہی لوگ اُن کو خرید کریں گے جو زیادہ قیمت ادا کرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا چھاتوں کی مقدار مطلوب کم ہو جائے گی اور اگر قیمت کم ہو جائے تو بہت سے لوگ جو پہلے چھاتوں کو استعمال نہیں کرتے تھے اب کمیِ قیمت کی وجہ سے استعمال کرنے لگ جائیں گے۔ لہٰذا ان کی مقدار مطلوب میں زیادتی ہو جائے گی۔

علیٰ ہذا القیاس رسد سے مراد کسی شے کی اس خاص مقدار سے ہے جو کسی خاص قیمت کے عوض میں فروخت کیے جانے کے لیے پیش کی جائے اور قانون رسد کو عام الفاظ میں اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ جس قدر قیمت بڑھتی جاتی ہے اسی قدر (بشرطیکہ زر نقد کی قوت خرید اور اس کی وہ رقم جو خریداروں کے قبضہ میں ہو مساوی رہے) مقدار اشیاء فروختنی بڑھتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ جب کسی شے کی قیمت زیادہ ملے گی تو ہر تاجر اُسی کی تیاری پر سرمایہ صرف کرے گا اور اگر کم ملے گی تو کوئی شخص اُس شے کی تیاری پر سرمایہ صرف نہ کرے گا۔ لہٰذا مقدار مطلوب پہلی صورت میں بڑھے گی اور دوسری صورت میں کم ہو گی۔

اب ہر دو قوانین مذکورہ پر غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ چونکہ ان دونوں میں ایک قسم کا اختلاف ہے اس واسطے تبادلۂ اشیاء کے لیے ضروری ہے کہ ان کی طلب و رسد میں ایک مساوات پیدا ہو ورنہ تبادلہ محال ہو گا اور جب تبادلہ محال ہو گا تو قدر کی تعیین کس طرح ہو گی۔ لہٰذا مختلف اقتصادی اسباب کے اثر سے اشیاء کی طلب اور رسد میں خودبخود ایک مساوات پیدا ہو جاتی ہے، جس کو بطور قانون کے اس طرح قائم کیا جا سکتا ہے کہ ہر منڈی میں اشیاء کی قیمت ان کی مقدار مطلوب اور مقدار فروختنی کی مساوات سے متعین ہو گی۔ اگر مانگ زیادہ ہو گی اور رسد کم، تو اشیاء کی قیمت معمول سے زیادہ بڑھ جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر مانگ کم ہو گی اور رسد زیادہ تو قیمت مذکور معمول سے کم ہو جائے گی۔ پس اشیاء کی قیمت صحیحہ (اس اصطلاح کا مفہوم ابھی واضح ہو جائے گا) کی تعیین کے لیے یہ ضروری ہے کہ طلب اور رسد میں مساوات پیدا ہو ــــ یعنی اشیاء کی طلب ان کی رسد کے مساوی ہو۔

اس قانون کے معانی کو زیادہ وضاحت سے بیان کرنے کی خاطر ہم مثال کے طور پر ایک جزیرہ فرض کرتے ہیں جہاں ایک ہزار کسان آباد ہے۔ فرض کرو کہ ان لوگوں کو اپنے کھیتوں کے لیے کھاد کی ضرورت ہے اور ہر کسان کھاد کے پانچ چھکڑوں کے عوض میں غلے کے دس پیمانے دینے کو تیار ہے۔ اس حساب سے گویا کھاد کے پانچ ہزار چھکڑے مطلوب ہیں جن کی قیمت فی چھکڑا دو پیمانے غلہ ہو۔ مگر ممکن ہے کہ قیمت مذکور پر کھاد کی رسد پانچ ہزار چھکڑوں سے زیادہ ہو یا کم۔ بعض آدمی شاید اس قیمت پر کھاد فروخت کرنے کی نسبت ماہی

گیری پر گزارا کرنا زیادہ فائدہ مند تصور کریں۔ اس طرح اگر کسان زیادہ قیمت نہ دیں گے تو کھاد کی رسد مطلق نہ ہو گی اور اگر ہو گی تو بہت کم، جو ان سب کے درمیان تقسیم ہو گی۔ لیکن اگر بعض کسان زیادہ قیمت دینے پر راضی ہو جائیں گے، تو قیمت کی زیادتی کی وجہ سے وہ لوگ ماہی گیری ترک کر دیں گے جو پہلے کھاد مہیا کرتے تھے اور کھاد کی رسد پھر زیادہ ہو جائے گی۔ برخلاف اس کے اگر کسی قدرتی سبب سے کھاد کی رسد زیادہ ہو جائے، تو جب تک اس کی طلب میں اس قدر زیادتی نہ ہو گی، تمام کھاد بیچنے والے ایک دوسرے کی نسبت مقابلتاً قیمت کو کم کرتے جائیں گے۔ کیونکہ ہر ایک کی خواہش یہی ہو گی کہ میرا ذخیرہ جلد بک جائے۔ قدرتاً ہر شخص کو اپنا فائدہ متصور ہو گا، خواہ دوسرے کا نقصان ہی کیوں نہ ہو۔

مثالِ بالا سے قانونِ طلب و رسد کا مفہوم تو واضح ہو گیا۔ لیکن ابھی اس سوال کا جواب دینا باقی ہے کہ طلب و رسد میں مساوات کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ ہم نے ابھی اصطلاح مقابلہ کا استعمال کیا ہے جس کے مفہوم کا ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ اس مقابلے کے اثر سے ہی طلب و رسد کے درمیان مساوات قائم ہوتی ہے۔ لہٰذا یہ بیان کرنے سے پیشتر کہ مساوات مذکور مقابلہ کے عمل سے کس طرح قائم ہوتی ہے، پہلے اس کا مفہوم واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس اصطلاح سے مراد اس مقابلے یا تجارتی رشک سے ہے جو کسی شے کے خریداروں اور بیچنے والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کا مدعا یہی ہوتا ہے کہ کم سے کم مقدار دے اور اس کے عوض میں زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل کرے۔ مقابلہ کا عمل باہمی اتحاد، رواج اور انسانی تاثرات کے منافی ہے۔ کیونکہ ہر شخص قدرتاً اپنی ذات کے لیے کام کاج کرتا ہے۔ جہاں چاہے اپنے مال کو فروخت کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ رواج کی پابندی اس کو کسی خاص مقام میں بیچنے پر مجبور نہیں کر سکتی اور نیز قدرتاً ہر شخص کو اپنی ذاتی منفعت متصور ہوتی ہے۔ کسی دوسرے کے نقصان وغیرہ کی اسے کچھ پروا نہیں ہوتی۔ یہ ہے مقابلے کا اقتصادی مفہوم۔ اب اس کا اثر سمجھنے کے لیے ذرا مثالِ مندرجہ بالا پر غور کرو۔ ہم نے اُوپر بیان کیا ہے کہ کھاد بیچنے والے مقابلے کی وجہ سے قیمت کم کرتے جائیں گے۔ اگر فی چھکڑا غلے کے دو پیمانے دیے جائیں، تو صاف ظاہر ہے کہ طلب اور رسد

غیر مساوی ہوں گے۔ کیونکہ کھاد فروختنی کی مقدار تو دس ہزار چھکڑا ہے لیکن مانگ صرف پانچ ہزار چھکڑوں کی ہے۔[۱] اگر قیمت اس سے بھی کم ہو جائے تو رسد شاید ۹ ہزار چھکڑے رہ جائے گی۔ کیونکہ بہت سے کھاد بیچنے والے کھاد مہیا کرنے کا کام چھوڑ کر کسی اور کام میں لگ جائیں گے۔ فرضاً اگر کسان یہ سمجھ کر کہ مقررہ مقدار کی نسبت زیادہ کھاد ڈالنے سے زمین کے محاصل یا پیداوار میں سے کھاد کی اس زیادہ مقدار کی قیمت نکل آئے گی اور اس خیال سے اور کھاد خریدنا شروع کر دیں، تو کھاد کی طلب جہاں پہلے پانچ ہزار چھکڑا تھی، اب شاید چھ ہزار چھکڑا ہو جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر قیمت اور کم ہو جائے تو رسد اور بھی کم ہو جائے گی۔ پہلے رسد ۱۰ تھی اور طلب ۵۔ پھر رسد ۹ ہو گئی اور طلب ۶۔ اسی طرح طلب شاید ۷ ہو جائے اور رسد ۸۔ غرض کہ دونوں مقداریں مقابلے کے اثر سے ایک دوسرے کے قریب ہوتی جائیں گی۔ فرض کرو کہ اس وقت جب کہ طلب اور رسد کی درمیانی نسبت ۸:۷ کی ہے کھاد کی قیمت فی چھکڑا ½۲ پیمانہ گیہوں پر ٹھہر گئی ہے۔ اب یہ بات کہ طلب اور رسد کے درمیان پوری مساوات کسی ایسی قیمت پر ہو گی جو قیمت مذکور سے بہت کم یا کسی قدر کم ہو، دو امور پر منحصر ہے۔

۱- کھاد کی اس مقدار کی افادت انتہائی پر جو سات ہزار چھکڑوں سے زائد ہو گی۔

۲- کھاد بیچنے والوں کی کوئی اور فائدہ مند پیشہ اختیار کر سکنے کی استطاعت پر۔ فرضاً اگر کوئی کسان ½۲ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے ۱۰ چھکڑے خرید کرے تو یہی قیمت مقرر ہو جائے گی، بشرطیکہ کوئی کھاد بیچنے والا قیمت مذکور سے کم قیمت پر کھاد مہیا کرنے پر راضی نہ ہو۔ لیکن اگر اس کسان کو ½۲ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے کھاد مل جائے تو وہ شاید پانچ چھکڑے اور خرید کر لے۔ اگر ایسا ممکن ہو تو ¼۲ پیمانہ گیہوں سے

[۱] چونکہ کسی شے کی رسد صرف اسی مقدار تک ہی محدود نہیں ہے جو کسی خاص وقت پر منڈی میں موجود ہو بلکہ اس تمام مقدار سے ہے جو اس شے کے بیچنے والے کسی خاص نرخ پر منڈی میں لانے کے لیے تیار ہوں جب تک کہ شے مذکور کی طلب قائم رہے۔ اس واسطے اس مثال میں ہم نے فرض کر لیا ہے کہ کھاد بیچنے والے دن بدن کھاد کی زیادہ زیادہ مقدار منڈی میں لاتے رہتے ہیں۔

ہی کھاد کی افادت انتہائی متعین ہو گی اور یہی اس کی قیمت فی چھکڑا قرار پا جائے گی۔
اسی طرح اگر اس کو ۲ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے اور کھاد مل سکے تو افادت انتہائی اسی نرخ سے متعین ہو گی۔ علیٰ ہذا القیاس ۱½ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے اور کھاد مل سکے تو یہی قیمت قرار پائے گی۔ الغرض ممکن ہے کہ کسان اس طرح کھاد کے بیس چھکڑے خرید لیوے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کھاد کے مختلف حصص کی افادت مختلف ہے۔ اگر یہ کسان بیس چھکڑے کھاد کے ایک ہی دفعہ خرید لیتا تو ہر چھکڑے کے لیے اسے مساوی قیمت ادا کرنی پڑتی اور یہ قیمت ۱½ پیمانہ گیہوں فی چھکڑا کے حساب سے ہوتی۔ کیونکہ منڈی میں (بشرطیکہ مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو) ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ان کی افادت انتہائی سے متعین ہوتی ہے اور بالعموم مساوی ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض اسباب اشیاء کی قیمت میں اختلاف پیدا کرتے ہیں۔ لیکن ان بواعث پر ہم آگے چل کر غور کریں گے۔ فی الحال ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کسی شے کی قیمت صحیحہ اس قیمت سے کیوں مختلف ہوتی ہے جس پر وہی شے تجارت کی منڈی میں فروخت ہوتی ہے؟

لفظ منڈی کی کئی تشریحات کی گئی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ ہر تجارتی شے کی ایک نہ ایک منڈی ضرور ہوتی ہے۔ مثلاً لوہے کی منڈی، چائے کی منڈی وغیرہ۔۔؟ علیٰ ہذا القیاس ایک ہی قصبے میں اشیاء کا تبادلہ کرنے والوں کے مختلف فریق ہوتے ہیں، جن کے درمیان ممکن ہے کہ ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت مختلف ہو۔ پس لفظ منڈی سے مراد اُن تمام افراد کی ہے جن کی طلب یا رسد کسی خاص مقام میں کسی خاص شے کی قیمت پر اثر کرے۔ اگر مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو کسی شے کی قیمت ہمیشہ اس کے مصارفِ پیدائش کے قریب ہو گی۔ یعنی شے مذکور کی رسد اس حصہ کے مصارفِ پیدائش پر جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہے اور یہ قیمت گویا اس شے کی افادت انتہائی کا پیمانہ ہو گی یعنی اس حصے کی افادت انتہائی کا جس کو خریدار اس خاص قیمت پر بغیر اندیشۂ نقصان کے خریدنا قبول کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ قیمت ان مساعی اور تکالیف کا معاوضہ ہو گی جو اس کے پیدا کرنے

والوں کو نہایت نامساعد حالات میں کام کرنے کی وجہ سے لاحق ہوئی ہیں۔ لیکن چونکہ تمام خریدار اس شے کی مساوی قیمت ادا کریں گے، اس واسطے ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے اسے نامساعد حالات میں پیدا کیا ہے ان کو فائدہ ہو گا۔ یعنی ان کا اجر ان تکالیف و مساعی سے زیادہ ہو گا جو اس کی تیاری کے ساتھ وابستہ ہیں اور جن لوگوں نے اسے نامساعد حالات میں پیدا کیا ہے ان کا اجر بمشکل ان کی مساعی اور تکالیف کے برابر ہو گا۔ مثلاً فرض کرو کہ چند شخص نہایت مساعد حالات میں کام کرتے ہیں۔ یا یوں کہو کہ ایک ایسی کان کھودتے ہیں جس پر معمولی محنت اور سرمایہ صرف کرنے سے عمدہ لوہا بافراط نکل آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ ان لوگوں کی نسبت بدرجہا فائدے میں رہیں گے جو اسی کام کو نامساعد حالات میں کرتے ہیں یا بالفاظ دیگر ایسی کان کھودتے ہیں جس سے لوہا نکالنے میں بہت سی محنت اور کثیر سرمایہ درکار ہے۔ مقدم الذکر فریق کے فائدے کی وجہ یہ ہے کہ خریدار دونوں کانوں کے لوہے کو مساوی قیمت پر ہی خریدنا قبول کریں گے جس سے پہلا فریق فائدہ میں رہے گا اور دوسرے فریق کو بمشکل اپنے اصل مصارف ہی پلے پڑیں گے۔

اگر لوہا بیچنے والوں کے درمیان مقابلہ پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو تو لوہے کی قیمت رفتہ رفتہ اس کے مصارفِ پیدائش کے قریب آ جائے گی۔ یہی قیمت جو مقابلے کی وجہ سے مصارفِ پیدائش کے قریب ہو جاتی ہے علم الاقتصاد کی اصطلاح میں قیمت صحیحہ کہلاتی ہے۔ لیکن چونکہ مقابلہ کبھی پورے طور پر عمل نہیں کرتا، اس واسطے منڈی میں ہر تجارتی شے کی ایک خاص قیمت ہوتی ہے جس کو اصطلاح میں قیمت متعارف کہتے ہیں۔ اور یہ قیمت قیمت صحیحہ سے کم و بیش مختلف ہوتی ہے کیونکہ اس سے بالعموم کسی شے کے مصارفِ پیدائش کا اندازہ نہیں ہو سکتا، اگرچہ خریدار کے لیے اس شے کی افادت انتہائی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے۔ قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کا یہ اختلاف مندرجہ ذیل وجوہ پر مبنی ہے۔

۱۔ کسی شے کے ذخیرے کی مقدار پر جو منڈی میں موجود ہو۔ یاد رکھنا چاہیے کہ ذخیرہ اور رسد مرادف الفاظ نہیں ہیں۔ ذخیرے سے مراد کسی شے کی اس تمام مقدار سے ہے، جو ایک خاص وقت پر منڈی میں موجود ہو اور رسد سے مراد کسی شے کی اس مقدار سے ہے جو

فروخت کے لیے پیش کی جا سکتی ہو، اگرچہ منڈی میں حقیقتہً موجود نہ ہو۔ لہٰذا ممکن ہے کہ رسد ذخیرے کا ایک تھوڑا سا حصہ ہو۔ مثلاً جب کسی شے کی قیمت کم ہو تو دکاندار قدرتاً اس شے کا سارا ذخیرہ نہیں بلکہ اس کا تھوڑا سا حصہ فروخت کے لیے پیش کریں گے، جو اس صورت میں رسد کہلائے گا۔ جب قیمت بڑھے گی وہ پہلے کی نسبت ذخیرے کی زیادہ مقدار فروخت کے لیے پیش کریں گے۔ غرض کہ قیمت کی زیادتی کے ساتھ ذخیرہ رسد کی صورت میں منتقل ہوتا جائے گا۔ برخلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ کسی منڈی میں رسد کی مقدار ذخیرے کی مقدار سے زیادہ ہو۔ مثلاً تجارتی دلال عموماً اشیاء کی ایک کثیر مقدار غلہ، روئی وغیرہ مہیا کرنے کا خریداروں سے معاہدہ کرتے ہیں، حالانکہ حقیقت میں مقدار معہودہ اس وقت اوّل تو ہوتی ہی نہیں یا اگر ہوتی ہے تو بہت کم۔ چونکہ خریداروں کی طلب اشیاء کی روزانہ پیداوار سے نہیں بلکہ ان کے ذخیرے سے پوری ہوتی ہے، اس واسطے ممکن ہے کہ اس ذخیرے کی کمی بیشی اشیاء کی قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کے درمیان اختلاف پیدا کر دے۔ مثلاً اگر کسی سال کمی رسد کی وجہ سے غلے کی قیمت زیادہ رہی ہے، تو دوسرے سال اس کی کاشت زیادہ ہوگی اور اس مزید ذخیرے کی وجہ سے جو اس طرح پیدا ہوگا ممکن ہے کہ قیمت معمول سے بھی کم ہو جائے۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر غلے کی رسد کم ہے تو اس کی جگہ مکئی بکنی شروع ہو جائے۔ اس صورت میں غلے کے ذخیرے کی کمی بیشی اس کی قیمت متعارف پر کچھ اثر نہیں کر سکتی۔ علیٰ ہذا القیاس بعض اشیاء ذخیرہ کھا سکتی ہیں۔ بعض میں ذخیرہ کھانے کی قابلیت نہیں ہوتی۔ یہ سبب بھی ذخیرے کی قیمت متعارف پر اثر کرتا ہے۔ مثلاً بعض اشیاء مچھلی وغیرہ (جو ذخیرہ نہیں کھا سکتی) کی قیمت منڈی میں صبح کچھ ہوتی ہے شام کچھ۔

۲- محنت کی تنظیم اور کلوں کا استعمال جس کی وجہ سے محنت کے لیے کسی اور پیشے اور سرمایے کے لیے کسی اور صورت میں منتقل ہو جانا مشکل ہو جاتا ہے۔ قیمت صحیحہ اور قیمت متعارف کے اختلاف کا دوسرا سبب ہے۔ محقق مارشل فرماتے ہیں کہ:

جن پیشوں میں سرمایہ قائم کا استعمال کثرت سے ہوتا ہے ان میں اشیاء کی قیمتیں بہت تغیر پذیر ہوتی ہیں۔

تمھیں یاد ہو گا کہ طلب و رسد کی توضیح کرتے ہوئے ہم نے کھاد مہیا کرنے والوں کی مثال لی تھی۔ ایسی مثال لینے سے ہماری غرض یہ تھی کہ پیشہ مذکور میں قیمت صحیحہ اور قیمت متعارف کے اختلاف کا یہ دوسرا اسبب کچھ اثر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہاں نہ بڑی کلوں کی ضرورت ہے نہ بڑے ہنر مند پیشہ وروں کی، جن کی محنت کسی دوسرے پیشے میں منتقل ہو سکتی ہو۔

۳- بسا اوقات رسم و رواج اور قانون سے بھی اشیاء کی قیمت متعارف متعین ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ پیشہ وروں کے عادات اور ان کے طبائع بھی بعض دفعہ قیمت کی کمی بیشی پر بہت بڑا اثر رکھتی ہیں۔ جب کسی پیشے کے دستکاروں کی یومیہ اُجرت ایک دفعہ مقرر ہو گئی، پھر سالوں تک بالعموم وہی اُجرت مقرر رہتی ہے۔ خواہ دستکاروں کی تعداد پہلے کی نسبت زیادہ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ تم نے سنا ہو گا نکاح پڑھانے والے مولوی اپنی خدمت کے عوض بالعموم $1\frac{1}{2}$ روپیہ ہی لیا کرتے ہیں۔ ایسی صورتوں میں افادت انتہائی کا اصول معطل ہو جاتا ہے اور قیمت رواج سے متعین ہوتی ہے۔ باپ اپنے مریض بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے کئی ہزار روپے دینے کے لیے بھی تیار ہو گا۔ مگر رواج کے اثر سے اسے حکیم کو وہی دو روپے نذرانہ دینے ہوتے ہیں۔

قیمت متعارف اور قیمت صحیحہ کے درمیان جو اختلاف ہوتا ہے اس کے بعض اخلاقی وجوہ بھی ہیں۔ مثلاً بعض دفعہ دکاندار افزائش قیمت کی توقع میں اپنا ذخیرہ اشیاء فروخت کے لیے منڈی میں لاتے ہی نہیں۔ اگرچہ نفع کی امید میں ان کو بسا اوقات نقصان ہی کیوں نہ ہو جائے۔ خوردہ فروشی کی صورت میں ان اخلاقی وجوہ پر غور کرنا اور بھی ضروری ہے۔ ہم نے اُوپر بیان کیا تھا کہ اگرچہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت مساوی ہوتی ہے، تاہم بعض اسباب اس مساوات کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ بالعموم خریدار ایسے ہوشیار نہیں ہوتے کہ اشیاء خریدنے کی اصل وقعت کو سمجھتے بوجھتے ہوں۔ اس واسطے دکاندار انھیں سادہ لوح سمجھ کر دھوکا بھی دے دیا کرتے ہیں اور اس طرح اپنی اشیاء کو دُگنی چوگنی قیمت پر بیچ لیتے ہیں۔ چونکہ ہر دکاندار اس طرح نہیں کرتا، اس لیے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی قیمت میں مساوات قائم نہیں رہتی۔ اس لحاظ سے بعض مصنفین کی رائے ہے کہ خوردہ فروشی کی صورت میں اشیاء کی قیمت مقابلے سے نہیں بلکہ رواج سے

متعین ہوتی ہے اور اس وجہ سے یہ امر معمولاً مسلم ہے کہ خوردہ فروشوں کو اصول عدل و اخلاق کے رو سے اپنی اشیاء کی قیمت اس قدر لینی چاہیے کہ تجارتی لحاظ سے اس قیمت سے کم قیمت قبول نہ کی جا سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اہل الرائے کے نزدیک خوردہ فروشی اقتصادی اصول پر نہیں بلکہ اخلاقی اصول پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خاص خاص حدود کے اندر یہ بات صحیح ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ تجارت کا یہ حصہ بھی مقابلے کے اثر سے معرا نہیں ہے۔

باب دوم

تجارت بین الاقوام

گذشتہ باب میں ہم نے تعیینِ قدر پر بحث کی ہے اور اس بات کو ثابت کیا ہے کہ اشیاء تجارتی کی قدر قانون طلب ورسد کے عمل پر منحصر ہے۔ مگر اس باب میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ آیا یہ قانون تجارت کی ہر صورت میں صادق ہے؟ ممکن ہے کہ جب تبادلۂ اشیاء ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے درمیان ہوتا ہو تو تعیین قدر اسی قانون کے تابع ہو۔ مگر جب یہ تبادلہ مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان ہوتا ہو تو اختلاف حالات کی وجہ سے تعیین قدر کا کوئی اور قانون ہو۔ اس کتاب کے حصہ اوّل میں ہم نے بیان کیا تھا کہ اختلاف حالات کی وجہ سے علمی اصول میں تغیر آ جانا ممکن ہے۔ لہٰذا اب ہمارا مقصد اس امر کی تحقیق کرنا ہے کہ آیا تجارت کی ہر دو مندرجہ بالا صورتوں میں قدرِ اشیاء کی تعیین ایک ہی اصول کے تابع ہے یا مختلف اصول کے تحت میں ہے۔ مگر پیشتر اس کے کہ اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی جائے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تجارت بین الاقوام کی عام خصوصیات اور اس کے فوائد سے تمھیں آگاہ کیا جائے۔ بعض محققین کی رائے میں تجارت بین الاقوام اس تجارت سے مختلف نہیں ہے جو ایک ہی ملک کے مختلف حصوں کے درمیان ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے لیے کسی نئے اصول کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہی پہلا قانون طلب ورسد یہاں بھی صادق آئے گا۔ یہ حکماء تجارت بین الاقوام پر مختلف اعتراض پیش کرتے ہیں جن میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

۱- تجارت کبھی مختلف اقوام کے درمیان ہوتی ہی نہیں بلکہ افراد کے درمیان ہوتی ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ انگلستان اور ہندوستان باہم تجارت کرتے ہیں، تو اس کا مفہوم یہ ہوا کرتا ہے کہ ہر دو اقوام میں سے خاص خاص افراد ہیں جو آپس میں تبادلۂ اشیاء کرتے ہیں۔

لہٰذا تعیین قدر کا جو قانون تجارت بین الافراد کی صورت میں صحیح ہے وہی تجارت بین الممالک کی صورت میں بھی صحیح ہو گا۔

۲- تجارت کی ہر صورت کے لیے تعیین قدر کا ایک منفرد اصول ہونا چاہیے، جو تمام حالات پر حاوی ہو۔ یہ بات علمی اصول کے خلاف ہے کہ ایک ہی قسم کے واقعات کی توجیہ کے لیے مختلف قوانین وضع کیے جائیں۔

۳- زمانۂ حال میں ایجادات کی وجہ سے فاصلہ اور بُعد موانع تجارت نہیں رہے۔ اس واسطے تجارت بین الاقوام یا بین الممالک کو تجارت کی دیگر صورتوں سے متمیّز کرنا صحیح نہیں ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ مختلف ممالک کی تجارتی اغراض میں ایک قسم کی یگانگت ضرور ہے۔ تاہم اقوام و ممالک کا اختلاف ایک ایسا صریح واقعہ ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی ایک ملک کی صورت میں یہ صحیح ہے کہ اس کے مختلف حصص کے درمیان محنت اور سرمایہ یا یوں کہو کہ دستکار اور سرمایہ دار بلا روک ٹوک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتے ہیں۔ بلکہ اقتصادی لحاظ سے لفظ قوم کی تعریف ہی یہ کی گئی ہے کہ یہ تجارتی اشیاء کے پیدا کرنے والوں کا ایک ایسا مجموعہ ہے جس کے مختلف اجزا کے درمیان محنت اور سرمایہ بلا روک ٹوک حرکت کر سکتے ہوں۔ اس تعریف کی رو سے لفظ قوم کے مفہوم میں دو شرائط داخل ہیں۔

۱- ہر ایک مجموعہ کے افراد کے درمیان سرمایہ اور محنت ایک مقام سے دوسرے مقام میں بلا قید منتقل ہو سکنا۔

۲- ایک مجموعے کے دستکاروں یا کارکنوں کا دوسرے مجموعے کی طرف منتقل نہ ہو سکنا۔ یعنی ایک ملک کے دستکاروں یا سرمایہ داروں کا دوسرے ملک میں نہ جا سکنا۔

مندرجہ بالا اعتراضات کا اصل منشاء زیادہ تر یہی ثابت کرنا ہے کہ خصوصاً زمانۂ حال میں ایک ملک کے دستکار اور سرمایہ دار دوسرے ممالک میں آسانی سے جا سکتے ہیں۔ کیونکہ فاصلے کی دقتیں جو زمانہ قدیم میں حائل تھیں، اب مختلف اقسام کی ایجادات و تسہیل سفر کی وجہ سے مفقود ہو گئی ہیں۔ ہم اس بات کو کسی حد تک تسلیم کرتے ہیں لیکن باوجود اس بات

کے یہ بھی صحیح ہے کہ سرمایے اور محنت کے ایک مجموعۂ افراد یا قوم کی طرف جاسکنے میں چند ایسی مشکلات ہیں جن پر غور کرنا ضروری ہے۔

اوّل- جغرافی اعتبار سے مختلف ممالک کے درمیان فاصلہ ہوتا ہے جس کی مقدار بعض دفعہ بہت بڑی ہوتی ہے۔

دوم- مختلف ممالک کی طرز حکومت مختلف ہوتی ہے۔ کہیں مطلق العنان حکومت ہے کہیں جمہوری۔

سوم- مختلف ممالک و اقوام کے مذاہب، اصول معاشرت و رسوم وغیرہ مختلف ہوتے ہیں۔ غرض کہ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مختلف اقوام کے درمیان سرمایہ اور محنت حرکت کر ہی نہیں سکتے، تاہم یہ صاف ظاہر ہے اس حرکت میں دقت ضرور ہے۔ اور یہی دقت تجارت بین الاقوام کو تجارت کی دیگر صورتوں سے متمیّز کرتی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اگر کسی ملک کے مختلف حصص کے درمیان سرمایہ اور محنت بلا روک ٹوک حرکت نہ کر سکتے ہوں تو اس ملک میں تجارتی مقابلہ مفقود ہو گا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مقابلے کی موجودگی یا عدم موجودگی سے تجارتی اشیاء کی قدر میں تغیر آ جاتا ہے۔ جس سے اگرچہ قانون طلب و رسد باطل نہیں ہو جاتا، تاہم متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ہم نے ابھی بیان کیا ہے کہ مختلف ممالک کے درمیان سرمایہ اور محنت آزادانہ حرکت نہیں کر سکتے۔ پس مندرجہ بالا اصول کے مطابق تجارت بین الاقوام کی صورت میں مقابلے کی عدم موجودگی کی وجہ سے قانون طلب و رسد کو متاثر ہونا چاہیے۔ موجودہ تحقیقات سے ہمارا مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ مندرجہ بالا سبب سے یہ قانون کس طرح اور کہاں تک متاثر ہوتا ہے؟ اس سوال کا جواب آگے چل کر دیا جائے گا فی الحال ہم تجارت خارجی کے چند فوائد بیان کرنا چاہتے ہیں۔

تجارت بیرونی یا تجارت بین الاقوام کے ذریعہ سے ہم وہ اشیاء حاصل کر سکتے ہیں، جو ہمارے ملک میں پیدا نہ ہوتی ہوں۔ یا تو اس وجہ سے کہ ہمارے ملک کی آب و ہوا ان اشیاء کی پیدائش کے لیے ناموافق ہے یا لوگوں میں صنعت و حرفت کی قابلیت ہی نہیں ہے کہ ان اشیاء کو تیار کر سکیں۔ غرض کہ تجارت خارجی سے ہر ملک دیگر ممالک کی پیدا کردہ اشیاء سے بہرہ

ور ہو سکتا ہے۔ علاوہ اس کے اس طریق عمل سے محنت اور سرمایے کی کارکردگی بہت بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً انگلستان میں لوہا اور کوئلہ اس کثرت سے پایا جاتا ہے کہ وہاں اس کی پیدائش کے لیے دیگر ممالک کی نسبت محنت اور سرمایہ کم صرف ہوتا ہے۔ لیکن اس ملک میں ایسی زمین بہت کم ہے جو قابل زراعت ہو۔ وہاں کا غلہ وہاں کے باشندوں کے لیے بھی کافی نہیں ہے اور اگر غلے کی پیداوار کو زیادہ کرنے کی کوشش کی جائے، تو بہت سی ناقص زمینیں کاشت کرنی پڑیں گی، جس سے غلے کی قیمت بہت گراں ہو جائے گی۔ دیگر ممالک مثلاً فرانس و ہندوستان وغیرہ میں غلہ بافراط پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر انگلستان اپنی اشیاء کا مبادلہ اُن ممالک کے غلہ سے کرے تو سب کو فائدہ ہو گا۔ ایک زمانے میں یہ خیال مروج تھا کہ تجارت بیرونی سے جو فوائد ہوتے ہیں ان کا تخمینہ اس زر نقد سے لگایا جاتا ہے جو ایک ملک سے دیگر ممالک کی طرف منتقل کیا جاوے۔ اس بنا پر ہر ملک کے لوگ یہی تقاضا کرتے تھے کہ اشیاء بر آمد میں زیادتی ہو اور اشیاء درآمد میں کمی کی جاوے۔ کیونکہ اوّل الذکر کی زیادتی سے زر نقد ہاتھ آتا ہے اور مؤخر الذکر کی زیادتی سے ہاتھ سے جاتا ہے۔ اس غرض کے حصول کے لیے بہت سی تجاویز عمل میں لائی جاتی تھیں۔ بر آمد کی مقدار بڑھانے کے لیے انعام دیے جاتے تھے اور درآمد کی مقدار کو کم کرنے کے لیے طرح طرح کے محصول لگائے جاتے تھے۔ اس طرح مختلف ممالک کے درمیان بجائے اتحاد کے اختلاف پیدا ہوتا تھا۔ اس طریق عمل کو نظام تجارت کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، لیکن اب ایک مدت سے اس کا اصل مغالطہ کھل گیا ہے، جس کی توضیح ذیل کی مثال سے ہو سکتی ہے۔ فرض کرو کہ انگلستان اور فرانس کی باہمی تجارت سے صرف یہی مراد ہے کہ انگلستانی لوہے کا مبادلہ فرانس کے غلے سے ہوتا رہے۔ نیز فرض کرو کہ فرانس میں ۲۷ من لوہا پیدا کرنے کے لیے اس قدر محنت اور سرمایہ درکار ہے جس قدر بیس من غلے کے لیے۔ مگر ولایت میں اس قدر سرمایہ اور محنت درکار ہے جس قدر دس من غلے کے لیے۔ اس لیے لوہے کی قدر بلحاظ غلے کے فرانس میں انگلستان کی نسبت دگنی ہے۔ اب اگر انگلستان اور فرانس ان دونوں اشیاء کا باہمی مبادلہ کریں تو دونوں کے حق میں مفید ہو گا۔ اگر فرانس ولایت کے ہر ۲۷ من لوہے کے واسطے ۱۵ من غلہ

مبادلے میں دے تو انگلستان کو ۵ من غلہ منافع میں رہے گا۔ علیٰ ہذا القیاس فرانس کو بھی فائدہ ہو گا۔ کیونکہ فرانس ۲۷ من لوہا خود پیدا کرے تو اسے اسی قدر محنت اور سرمایہ صرف کرنا پڑے گا جس قدر ۲۰ من غلے کے پیدا کرنے کے لیے درکار ہے۔ مفروضہ صورت میں اس کو صرف ۵ من غلہ دینا پڑے گا۔ اس لیے دونوں فائدے میں رہیں گے اور کسی کا بھی نقصان نہ ہو گا۔

اس مثال سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ تجارت خارجی کے فوائد حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری شرط ہے کہ اشیاء متبادلہ کی قدر اضافی ہر دو ممالک میں مختلف ہو، ورنہ تجارت مذکور کا کچھ فائدہ نہ ہو گا، بلکہ اخراجات بار برداری ضائع ہوں گے۔ مذکورہ اختلاف تجارت خارجی کی مقدم شرط ہے اور اصطلاحاً اختلاف مصارف متقابلہ کہلاتا ہے۔ لیکن بعض اہل الرائے کہتے ہیں کہ تجارت خارجی کی اس مقدم شرط سے دو مضرت رساں نتیجے پیدا ہوتے ہیں جن سے گریز نہیں کی جاسکتی۔

۱- اگر تجارت خارجی اختلاف مصارفِ متقابلہ پر مبنی ہے تو ممکن ہے کہ بعض ممالک کو دیگر ممالک سے ایسی اشیاء حاصل کرنے میں فائدہ ہو جن کو وہ خود نسبتاً کم مصارف پر پیدا کر سکتے ہیں۔

۲- ممکن ہے کہ بعض ممالک خاص خاص اشیاء کا پیدا کرنا ترک کر دیں جن کے لیے وہ قدرتاً یا دیگر اسباب کی وجہ سے نسبتاً زیادہ موزوں ہیں اور یہ سمجھیں کہ ان خاص اشیاء کو دیگر ممالک سے تبادلے میں حاصل کرنا زیادہ مفید ہے۔ ان ہر دو نتائج کا مفہوم ایک مثال سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ فرض کرو کہ الف اور ب دو مختلف ممالک ہیں اور ن اور ق دو اشیاء ہیں جن کے پیدا کرنے کے لیے ہر ملک بجائے خود ایک خاص قابلیت رکھتا ہے۔ نیز فرض کرو کہ الف کی قوت پیداوار ۲ن یا ۳ق ہے اور ب کی ان یا ۲ق ہے ظاہر ہے کہ اگر دونوں کے درمیان کوئی تبادلہ نہ ہو تو کل پیداوار ۳ن + ۵ق ہو گی۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ن ق سے قدر میں زیادہ ہے۔ کیوں کہ ملک الف میں دونوں کے پیدا کرنے کے لیے اس قدر محنت اور سرمایہ درکار ہے جس قدر ۳ق کی پیدائش کے لیے اور ملک ب میں ایک ن کی پیدائش کے

لیے اس قدر سرمایہ درکار ہے جس قدر ۲ق کے لیے۔ لہٰذا ملک الف کے لیے تجارتی لحاظ سے یہ بھی مناسب ہے کہ وہ صرف ن ہی پیدا کرے اور ب کے لیے یہی مناسب ہے کہ وہ صرف ق ہی پیدا کرے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ظاہر ہے کہ ملک الف کو دونوں اقسام کی اشیاء کی پیدائش میں سہولت ہے اور نیز ق کی پیدائش میں بہ نسبت ن کے اس کو زیادہ سہولت ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ان نتائج کو کسی حد تک تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تمام تجارت خارجی اس قسم کی نہیں ہوتی جیسی کہ مثال بالا میں فرض کی گئی ہیں۔ بالعموم ہر ملک ایسی اشیاء ہی تبادلے میں لیتا ہے جن کا پیدا کرنا قدرتی طور پر یا دیگر اسباب کی وجہ سے اس ملک کے لیے مشکل ہو۔ پس تجارت خارجی کا سب سے پہلا فائدہ یہ ہے کہ اس سے ہر ملک مستفید ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے کئی دیگر فوائد بھی اس سے پیدا ہوتے ہیں جو مختصراً مندرجہ ذیل ہیں:

۱- تجارت خارجی کی وساطت سے ہر ملک کو بغیر کاوش کے ایسی اشیاء دستیاب ہو سکتی ہیں جن کو یہ بغیر دقت کے پیدا نہ کر سکتا۔

۲- تجارت خارجی انقسام محنت کی ایک صورت ہے جس سے ہر ملک ان اشیاء کی تیاری میں اپنا سرمایہ صرف کرتا ہے جن کے پیدا کرنے کے لیے وہ خصوصیت سے موزوں ہے اور جن کی تیاری سے فائدہ کی زیادہ سے زیادہ مقدار حاصل ہو۔

۳- تجارت خارجی کی وساطت سے اشیاء کی فروخت کے لیے منڈیاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔

۴- تجارت خارجی کی وساطت سے مختلف اقوام کے دستکار اپنی اپنی ہنر مندی میں بے انتہا ترقی کر سکتے ہیں۔

۵- تجارت خارجی سے مختلف اقوام کا میل جول ہوتا ہے جس سے کئی ایک تمدنی اور اخلاقی فوائد پیدا ہوتے ہیں۔

تجارت خارجی کی عام خصوصیات اور فوائد بیان کرنے کے بعد اب ہم اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی وہ کون سے شرائط ہیں جن کے لحاظ سے تجارت خارجی کا منافع تبادلے کے مختلف فریقوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے؟ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ تجارت

خارجی کی خصوصیات ان اشیاء کی قدر پر کس طرح اثر کرتی ہیں جو اس تجارت کا مقصود ہیں؟ یا مختصراً شرح تبادلہ کن اسباب سے متعین ہوتی ہے؟

تجارت بین الافراد کی صورت میں یہ معلوم کرن۱۰ مشکل ہو جاتا ہے کہ فریقین تبادلہ کے درمیان شرح تبادلہ کیا ہو گی۔ اس مشکل کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں پورے حالات نہیں معلوم ہوتے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ بھلا ہمیں کس طرح علم ہو سکتا ہے کہ ایک خاص فرد کو کسی خاص شے کی کس قدر شدید ضرورت ہے۔ لیکن تجارت بین الاقوام کی صورت میں اقوام کی ضروریات کا اندازہ کسی قدر ہو سکتا ہے۔ لہٰذا تجارت کی اس خاص صورت میں بھی بشرطیکہ مختلف ممالک کے درمیان سرمایہ، محنت اور تجارتی اشیاء بلا روک ٹوک جا آسکتی ہوں۔ تعیین قدر کا وہی پہلا اصول صحیح معلوم ہوتا ہے یعنی شرح تبادلہ تجارت بین الاقوام کی صورت میں بھی اسی مساوات پر منحصر ہے جو مختلف اقوام کی طلب و رسد اشیاء کے درمیان ہو۔[1] مثلاً دو ملک ہیں الف اور ب۔ مقدم الذکر لوہا پیدا کرتا ہے اور مؤخر الذکر شراب۔

---

[1] یہ امر علوم ریاضیہ کی مدد سے مندرجہ ذیل طور پر ثابت ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس تشریح کی ضرورت نہ تھی تاہم اس خیال سے کہ طلباء کو علوم کی باہمی استمداد کا طریق معلوم ہو ہم اس کو یہاں درج کرتے ہیں۔ فرض کرو کہ دو اشیاء متبادلہ ہیں جن کو مختلف مقادیر میں تقسیم کرنے سے ان کے ذاتی خواص میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جتنی مقداروں میں چاہو تقسیم کر کے ان کا باہمی تبادلہ کرتے جاؤ۔ نسبت تبادلہ وہی رہے گی۔ فرض کرو کہ ان کے تبادلے کی وہی نسبت ہے جو ق:ن سے ہے ظاہر ہے کہ ق کا ہر دسواں حصہ یا گیارہواں حصہ ن کے ہر دسویں حصے یا گیارہویں حصے کے عوض میں دیا جائے گا کیونکہ ان اشیاء کے مساوی حصص کے درمیان تمیز کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ پس یہ نتیجہ اس طرح پر ظاہر کیا جاسکتا ہے کہ $\frac{\text{دن}}{\text{دق}} = \frac{\text{ن}}{\text{ق}}$ (د کو ن کے ساتھ ضرب دینے سے ہماری مراد اشیاء متبادلہ کے مساوی حصص ظاہر کرنے کی ہے۔ اس نتیجہ کو ملحوظ خاطر رکھ کے فرض کرو کہ ل ق گندم کی ایک خفیف سی مقدار سے اور ل ن آہن کی ایک خفیف سی مقدار جو اس کے عوض میں دی جاتی ہے۔ چونکہ گندم اور آہن دونوں ایسی اشیاء ہیں کہ ان کو مختلف مقادیر میں تقسیم کرنے سے

ان کے خواص ذاتیہ میں کوئی فرق نہیں آتا اس واسطے ظاہر ہے کہ ایک ہی منڈی میں ان کے مساوی حصص کے درمیان نسبت تبادلہ وہی ہو گی جو ان کے کل مقداروں کے درمیان ہے لہذا اگر ق کل مقدار گندم کی ہو جو ن یعنی کل مقدار آہن کے عوض میں دی جاتی ہے۔ تو ل ن اور ل ق کے درمیان وہی نسبت تبادلہ ہو گی جو اور ق کے درمیان ہے۔ لہذا ل ن/ل ق یا ل ن= ن/ق × ل ق۔ موازنہ تجارت کی حالت میں ان ہر دو مقادیر کی طلب ہر دو فریق تبادلہ کے لیے مساوی ہو گی۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو اور تبادلے کی ضرورت پڑے گی۔ اب دیکھو کہ ل ن یعنی آہن کی مقدار ل ق یعنی گندم کے مقدار سے ن/ق گنا بڑی ہے۔ پس ان کی طلب کے درمیان مساوات قائم رکھنے کی غرض سے یہ ضروری ہے کہ آہن کی طلب گندم کی طلب سے ق/ن گنا بڑی ہو جس سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ ”اشیاء متبادلہ کی طلب ان کی مقادیر متبادلہ کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ہے۔“ اب فرض کرو کہ پہلے فریق تبادلہ یا ا کے پاس گندم کی مقدار س تھی اور دوسرے فریق ب کے پاس آہن کی مقدار ص تھی چونکہ تبادلے میں گندم کا ق حصہ آہن کے ن حصہ کے عوض دیا جاتا ہے اس واسطے تبادلے کے بعد مندرجہ ذیل صورت ہو گی۔ الف کے پاس (س-ق) گندم ہو گی اور ن آہن اور ب کے پاس ق گندم ہو گی اور (ص-ن) آہن۔ اگر فرضاً الف کی طلب گندم کو اح (س -ق) سے اور ب کی طلب گندم کو ۲ح ق سے علی ہذا القیاس الف کی طلب آہن کو اع ن سے اور ب کی طلب آہن ۲ع (ص-ن) سے تعبیر کیا جائے تو الف تبادلے پر رضا مند نہ ہو گا۔جب تک کہ مندرجہ ذیل مساوات صحیح نہ ہو:-یعنی

1ح (س-ق) X دق = 1ع ن X د ن یا 1ح (س-ق) /1ع ن = دن/دق۔ چونکہ مندرہ بالا اصول کے مطابق دن/دق = ن/ق ہے لہذا 1ح (س-ق)/ 1ع ن = ن/ق ۔ علی ہذا القیاس جو کچھ الف کی صورت میں صحیح ہے وہی ب کی صورت میں بھی صحیح ہونا چاہیے۔ یا یوں کہو کہ اس کی طلب آہن (یعنی ان مقادیر آہن کی طلب جن کا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا ہے) ب کی طلب گندم کے مساوی ہونی چاہیے (یعنی ان مقادیر گندم کی طلب جن کا تبادلہ سب سے آخر میں ہوا ہے) لہذا مندجہ ذیل مساوات ب کی صورت میں صحیح ہونی چاہیے:

ظاہر ہے کہ اگر الف کو شراب کی زیادہ ضرورت ہے اور ب کو لوہے کی اس قدر ضرورت نہیں ہے، تو شراب کی تھوڑی سی مقدار کے عوض میں ب کو بہت سی مقدار لوہے کی دینی ہوگی۔ اس واسطے یہ ممکن ہے کہ کوئی ملک دیگر ممالک سے ایسی اشیاء حاصل کرتا رہے جن کو یہ خود نسبتاً کم مصارف پر پیدا کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کا اپنا سرمایہ اور محنت ایسی اشیاء کے پیدا کرنے میں صرف ہوتی رہے۔ جن کے پیدا کرنے کے لیے یہ خصوصیت سے موزوں ہے۔ پس ایسی اشیاء کی قدر جن کو ہم دوسرے ملک سے تبادلے میں حاصل کرتے ہیں ان مصارف پر منحصر نہیں ہے، جو ان اشیاء کو اپنے ملک میں پیدا کرنے سے ہمیں ادا کرنے پڑتے اور نہ یہ ان مصارف پر منحصر ہے جو اس ملک کو ادا کرنے پڑتے ہیں جہاں یہ پیدا کی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ قدر ان اشیاء کے مصارفِ پیدائش پر منحصر ہے جو ہمیں ان کے عوض میں (کرایہ بار برداری کو ملحوظ رکھ کر) دیگر ممالک کو تبادلے میں دینے پڑتے ہیں۔ مثلاً اُوپر کی مثال میں ملک الف میں شراب کی قدر اس لوہے کے مصارفِ پیدائش پر منحصر ہے جو شراب مذکور حاصل کرنے کی غرض سے تبادلے میں دیا جاتا ہے۔

عام صورتوں میں تو یہ صحیح ہے کہ شرح تبادلہ قانون طلب ورسد کی رو سے ہی متعین ہوتی ہے مگر جیسا کہ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں۔ تجارت بین الاقوام میں چند ایک خصوصیات ہیں جن سے یہ قانون متاثر ہوتا ہے۔

اوّل- یہ کہ بعض اوقات فریقین تبادلہ آپس میں اتفاق کر کے ایک خاص شرح تبادلہ مقرر کر لیتے ہیں۔

دوم- اگر اشیاء متبادلہ کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کے تابع ہو، تو جب ان کی پیداوار ایک ملک میں نقطہ تقلیل تک پہنچ جائے گی تو دیگر ممالک ضرورت سے مجبور ہو کر اسی

۲ع (ص-ن) X دن = ۲ح ق X د ق یا ۲ح ق / ۲ع (ص-ن) = ن/ق لہذا کلیہ اصول یہ قائم ہوا کہ تبادلۂ اشیاء (ایسی اشیاء کے لیے جو بغیر ذاتی اوصاف کھونے کے مختلف مقادیر میں تقسیم ہو سکتی ہوں) کے لیے مندرجہ ذیل دو مساواتیں صحیح ہونی چاہییں:

اح (س-ق) / اع ن = ن /ق = ۲ح ق / ۲ ع (ص -ن)

شے کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ تجارت بین الاقوام کا دائرہ دن بدن تنگ ہوتا جائے گا جس سے شرح تبادلہ پر ایک نمایاں اثر ہو گا۔

سوم- بعض حالات یعنی بُعد مسافت اور کثرتِ مصارف بار برداری وغیرہ کی وجہ سے مختلف اقوام کے درمیان تجارتی مقابلہ مفقود ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس کی موجودگی یا عدم موجودگی سے اشیاء تجارتی کی قدر میں تغیر آجاتا ہے۔ مثال کے لیے فرض کرو کہ فرانس میں نہایت عمدہ کاغذ تیار ہوتا ہے جو ہندوستان اپنی اشیاء کے تبادلے میں اس سے لیتا ہے۔ نیز فرض کرو کہ دیگر ممالک بعض وجوہ سے اس صنعت میں فرانس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس صنعت سے فرانس خاصتہً فائدہ اٹھائے گا۔ مگر جب اور قومیں فرانس کا مقابلہ کرنے کو آمادہ ہو جائیں گی اور کاغذ تیار کریں گی، تو ظاہر ہے کہ کاغذ کی قدر میں فرق آجائے گا اور ہندوستان کو اس مقابلے کی وجہ سے فائدہ ہو گا۔

چہارم- بعض اوقات ایسے موانع پیش آجاتے ہیں کہ دو مختلف ممالک کے تجار کو تبادلۂ اشیاء میں مشکلات ہوتی ہیں مثلاً کثرتِ مصارف بار برداری، دلالوں کی دلالی اور محصول درآمد و برآمد۔ ان اسباب سے اشیاء کی قدر میں تغیر آجاتا ہے اور تجار کے فائدے میں کمی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ اسباب بھی شرح تبادلہ پر اپنا اثر کیے بغیر نہ رہیں گے۔ غرض کہ اس قسم کے بعض اسباب اور بھی ہیں جو شرح تبادلہ پر اثر کرتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ قانونِ کلیہ طلب و رسد ان اسباب کے اثر سے باطل نہیں ہو جاتا۔ ہاں اس کا عمل ان کے اثر سے متاثر ضرور ہوتا ہے۔ ابھی حال ہی کا ذکر ہے ولایتی شکر ہمارے ملک میں اس کثرت سے آنی شروع ہو گئی کہ ایک روپے کی پانچ سیر بکنے لگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے ملک میں لوگوں نے گنوں کی کاشت ہی چھوڑ دی۔ کیونکہ ولایتی شکر دیسی شکر سے مقابلتاً سستی ملتی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر سرکار ہند نے ولایتی شکر پر اب اس قدر محصول درآمد لگا دیا ہے کہ یہ ہماری دیسی شکر سے سستی نہ بک سکے گی۔ اس مثال سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے ملک میں ولایتی شکر کی تعیین قیمت میں قانون طلب و رسد کا اس قدر دخل نہیں ہے جس قدر کہ سرکار دولت مدار کے حاکمانہ فعل کا۔

اس[1] ضمن میں یہ بیان کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب دو ممالک آپس میں تجارت کرتے ہیں تو بسا اوقات ایک ملک دوسرے ملک کا زیر بار ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زیر بار شدہ ملک کی اشیاء بر آمد و درآمد کے درمیان مساوات قائم نہیں رہتی۔

---

[1] تبادلات خارجی کا مضمون علم الاقتصاد کا ایک بڑا ضروری حصہ ہے۔ لیکن چونکہ اس کا تعلق زیادہ تر عمل سے ہے اور اس کا کامل طور پر سمجھنا تجربے پر انحصار رکھتا ہے اس واسطے ہم مختصر طور پر یہ بیان کر دیتے ہیں کہ تبادلات خارجی اس طریق عمل کا نام ہے جس کی وساطت سے قومیں ایک دوسری کا قرض ادا کرتی ہیں۔ قدیم زمانے میں جب ایک ملک کے سوداگر کسی دوسرے ملک کے سوداگروں کے قرض خواہ ہوا کرتے تھے تو مقروض ملک سے قرض خواہ ملک کی طرف زر مسکوک ارسال کرنا پڑتا تھا۔ مگر اب یہ دقت مفقود ہو گئی ہے کیونکہ باہمی ہنڈیوں کے استعمال سے زر نقد کے استعمال کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ زمانہ حال میں تبادلے سے مراد کسی اور ملک میں زر نقد کی ایک خاص مقدار وصول کرنے کا حق ہے، جس کا اظہار ایک دستاویز کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ کلکتہ کے ایک سوداگر نے دس ہزار روپیہ کا مال ولایت کے ایک سوداگر سے خریدا ہے اور ولایت کا ایک اور سوداگر کسی ہندوستانی سوداگر کا مقروض ہے۔ مذکورہ بالا طریق عمل کے رو سے کلکتہ کا سوداگر اپنے ہم وطن ہندوستانی سوداگر سے روپیہ وصول کر لے گا اور ولایت کا مقروض سوداگر اپنے ہم وطن قرض خواہ سوداگر کو رقم مذکور ادا کر دے گا۔ اس طرح دونوں ملکوں کا حساب بغیر ترسیل زر کے بے باق ہو جائے گا۔ لیکن اگر کسی ملک کے سوداگر کے ذمے کچھ باقی رہ جائے تو وہ زر نقد کی صورت میں ادا کرنا پڑے گا۔ موجودہ تجارتی نظام میں باقی ادا کرنے کی یہ ذرا سی دقت بھی نہیں رہی کیونکہ شہر لندن انگریزی قوم کی تجارتی حیثیت کی وجہ سے دنیا کا تبادلہ گاہ بن گیا ہے۔ جس کی معرفت دنیا کی قومیں اپنا حساب کتاب فیصلہ کر لیتی ہیں۔ مثلاً اگر صوبجات متحدہ امریکہ انگلستان کے قرض خواہ ہوں اور دیگر ممالک کے مقروض ہوں تو انگلستان کے دارالسلطنت کی معرفت فیصلہ کرنے سے ممکن ہے کہ ترسیل زر کی نوبت ہی نہ آئے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ دیگر ممالک جو صوبجات متحدہ امریکہ کے قرض خواہ ہیں خود انگلستان کے مقروض ہوں۔ مگر باوجود اس کے ممکن ہے کہ بعض اقتصادی اسباب کا اثر اس امر کا متقاضی ہو کہ شہر لندن سے زر نامسکوک کی مقدار رفتہ رفتہ خارج ہو کر کم ہوتی جائے۔ ان اسباب کے اثر کو روکنے کے لیے انگلستان کا بنک شرح سود کو زیادہ کر دیتا ہے اور وہاں کے دیگر بنک بھی اس کی تقلید کرتے ہیں جس سے انگلستان میں شرح سود بالعموم متاثر ہو جاتی ہے۔ اور دیگر ممالک کے قرض خواہوں کو اس بات کی تحریک ہوتی ہے کہ وہ زیادہ شرح سود لینے کی غرض سے اپنا روپیہ انگلستان میں ہی رہنے دیں۔

کیونکہ اس کو نہ صرف اپنی درآمد کے عوض میں اشیاء بھیجنی پڑتی ہیں بلکہ اپنے قرض کی ادائیگی میں یا تو اپنی اشیاء برآمد میں زیادتی کرنی پڑتی ہے یا مزید روپیہ ادا کرنا پڑتا ہے۔اس وجہ سے ایک ملک میں روپیہ کی مقدار بڑھتی جاتی ہے اور دوسرے میں کم ہوتی جاتی ہے۔ جہاں روپے کی مقدار بڑھتی ہے وہاں اس کی قدر کم ہوتی ہے اور اشیاء کی قیمت بڑھتی ہے۔ لہٰذا وہاں اشیاء کی فروخت سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی برآمد اس کی درآمد سے بہت زیادہ ہے۔چونکہ ہم اپنی ضروریات کے لیے انگلستان کے محتاج ہیں اس واسطے ہم زیر بار ہیں۔ علاوہ اس کے ہم کو سلطنت ہند کے مصارف، حکام کی تنخواہیں اور فوجی اخراجات وغیرہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا ملک دن بدن زیادہ سے زیادہ زیر بار ہو جاتا ہے۔ مزید برآں ہمارے ملک میں کئی وجوہ کے باعث (مثلاً خارجی حملہ آوروں کا ہندوستان کی قدیم جمع کردہ دولت کو لوٹ کر لے جانا، اخیر کے مغلیہ بادشاہوں کی عیاشی، عوام کی ناعاقبت اندیشی اور کمی تعلیم کی وجہ سے روپیہ کی اصل حقیقت سے بے خبری وغیرہ) سرمایے کی مقدار کم ہے۔ انگلستان کے قبضے میں سرمایے کی بے انتہا مقدار ہے، اس واسطے ہمارے ملک میں رفاہ عام کے کاموں مثلاً آب پاشی وغیرہ میں بھی اس ملک کا سرمایہ صرف ہوتا ہے جس سے انگلستان فائدۂ عظیم اٹھاتا ہے۔ اگرچہ ہم کو بھی اس سے فائدہ پہنچتا ہے، جس کی تشریح اس کتاب کے کسی اور باب میں کی گئی ہے۔

چونکہ انگلستان کے مصارف ہمیں پونڈوں میں ادا کرنے پڑتے ہیں، اس واسطے چاندی کی قدر میں تنزل آجانے کی وجہ سے ہمیں اور بھی نقصان ہوا کرتا تھا، لیکن اب اجرائے سکہ طلائی کے باعث اس مشکل کا اندیشہ نہیں رہا۔ مگر ہمارے نقصان کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہمارا ملک صنعت و حرفت کے میدان میں بہت پیچھے ہے اور اہل ملک بسبب کمی تعلیم کے اس ضرورت کو محسوس نہیں کرسکتے۔ ہم صرف وہی اشیاء پیدا کرتے ہیں جو قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہیں اور صنعتی اشیاء کے لیے دیگر ممالک کے محتاج ہیں۔ گذشتہ چند سالوں سے ہم نے جاپان کی تقلید کر کے صنعت کی طرف کچھ توجہ کی ہے۔ امید ہے کہ یہ تحریک نہایت مفید ثابت ہو گی اور اہل ملک کے لیے ہر پہلو سے نتیجہ خیز ہو گی۔ اگرچہ ہم فی الحال اس قابل

تو نہیں کہ ہمارے ملک کی تیار کردہ اشیاء یورپ کے بازاروں میں بک سکیں۔ تاہم ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارے ہندوستانی بھائی بارہ لاکھ کے قریب مختلف بیرونی جزائر مثلاً ماریشس، گائینا، فجی، ٹرینیڈاڈو غیرہ میں آباد ہیں، جن کے ساتھ تجارتی تعلقات قائم کرنے سے ہمارے ملک کے تاجر بے انتہا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

باب سوم

زرِ نقد کی ماہیت اور اس کی قدر

تبادلۂ اشیاء انقسام محنت کا لازمی نتیجہ ہے۔ مختلف ممالک بالعموم وُہی اشیاء پیدا کرتے ہیں جن کی پیدائش کے لیے ان کی آب و ہوا اور دیگر حالات بالاختصاص موزوں ہوتے ہیں اور اپنی ذاتی ضرورت کی چیزیں ان اشیاء کے تبادلے میں دیگر ممالک سے حاصل کر لیتے ہیں۔ اس قسم کے تبادلے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اشیاء کی قدر کا ایک خاص معیار معین کیا جائے، کیونکہ محض مبادلے سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر کسی کفش ساز کو ٹوپی کی ضرورت ہو تو ظاہر ہے کہ اسے کسی ایسے کلاہ ساز کی تلاش کرنی چاہیے جس کو جوتی کی ضرورت ہو ورنہ اس کی ضرورت کا پورا ہونا ناممکن ہے۔ لہٰذا کسی خاص شے کی تعیین بطور معیار قدر ضروری ہے، جس کو ہر فرد تبادلے میں قبول کر سکے۔ مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں اس غرض کے لیے مختلف اشیاء استعمال کی گئی ہیں۔ مثلاً نمک، چاول، چائے وغیرہ۔ مگر چونکہ ان کے استعمال میں صدہا دقتیں تھیں، اس واسطے ضرورت نے خود بخود ایک ایسی شے دریافت کر لی جو اس غرض کو بوجہ احسن پورا کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس غرض کو پورا کر سکنے کے لیے کوئی اس قسم کی شے ہونی چاہیے جو:

۱- ذاتی قدر رکھتی ہو۔

۲- آسانی سے منتقل ہو سکتی ہو۔

۳- پرانی ہو جانے سے اس کی قدر میں تغیر نہ آ سکتا ہو۔

۴- چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم ہو سکتی ہو۔

۵- تھوڑی مقدار میں قدر زیادہ رکھتی ہو۔

۶- اس کی قدر بالعموم یکساں رہتی ہو۔

۷- اس کا کھرا کھوٹا ہونا جلدی پرکھا جا سکتا ہو۔

۸- اس کے سکے آسانی سے بن سکتے ہوں۔

غور کرنے پر معلوم ہو گا کہ یہ تمام اوصاف بطریق احسن چاندی اور سونے میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا دنیا کی مہذب قوموں نے انھی دو دھاتوں کو بطور معیار قدر اختیار کر لیا، جس سے تبادلے کی دقتیں مفقود ہو گئیں۔ ذرا خیال تو کرو اگر حروف نہ ہوتے، تو خیالات انسانی کے اظہار میں کس قدر دقت ہوتی۔ سونے چاندی کو اشیاء سے وہی علاقہ ہے جو حروف کو ہمارے خیالات سے ہے۔ لہٰذا اس معیار کا دریافت ہونا تمدن انسانی کی تاریخ میں ایجاد حروف سے کم وقعت نہیں رکھتا۔

فرض کرو کسی شراب فروش کو روٹی کی ضرورت ہے اور وہ ایک نان فروش سے کہتا ہے کہ مجھ سے شراب لے لو اور مبادلے میں مجھے روٹی دے دو۔ مگر ممکن ہے کہ نان فروش کو یا تو شراب کی ضرورت ہی نہ ہو یا اگر ہو تو اتنی شراب کی ضرورت نہ ہو جس کی قدر روٹی کی قدر کے مساوی ہو۔ شراب فروش روٹی لے لیتا ہے اور مبادلے میں نان فروش کو اس قدر شراب دے دیتا ہے جس قدر کہ اس کو ضرورت ہے اور بقایا حساب کو بے باق کرنے کے لیے مذکورہ بالا معیار قدر کی کچھ مقدار ادا کر دیتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر نان فروش کو شراب کی مطلق ضرورت نہ ہوتی تو شراب فروش کو معیار قدر کی زیادہ مقدار ادا کرنی پڑتی۔ اب فرض کرو کہ نان فروش کو شراب کی مطلق ضرورت نہیں ہے بلکہ اسے کپڑے کی ضرورت ہے۔ معیار قدر کی وہ مقدار جو اس نے شراب فروش سے حاصل کی ہے جیب میں ڈال کر بزاز کی دکان پر جاتا ہے اور وہاں سے وہ شے حاصل کرتا ہے جس کی قدر اس روٹی کی قدر کے مساوی ہے جو اُس نے شراب فروش کے پاس فروخت کی تھی یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جو شے اس کو شراب فروش کی طرف سے واجب الادا تھی وہ بزاز نے مہیا کر دی۔ لفظ واجب الادا پر غور کرو کیونکہ اس لفظ میں زر نقد کی پوری حقیقت یا ماہیت مخفی ہے۔ مثال بالا سے واضح ہوتا ہے کہ جب مبادلہ غیر مساوی ہو تو معیار قدر یا زر نقد کی ضرورت پڑتی ہے۔ گویا زر نقد یا معیار قدر اس حق کی علامت ہے جو مبادلہ غیر مساوی کی صورت میں ایک فریق کو دوسرے فریق

پر حاصل ہے۔ زمانۂ حال میں اس معیار قدر کو زر نقد سے تعبیر کرتے ہیں اور دنیا کی تمام مہذب اقوام نے اس کو اس قسم کے حقوق کی علامت قرار دیا ہے۔ پس زر نقد اس حق کی علامت ہے جو اس شخص کو حاصل ہے جس نے کسی اور شخص کو کوئی شے دی ہے یا اس کی کوئی خدمت کی ہے اور اپنی خدمت یا شے کے مبادلے میں شخص مذکور سے کوئی مساوی القدر شے حاصل نہیں کی یا کوئی مساوی القدر خدمت نہیں لی۔ اس تعریف سے یہ اصول قائم ہوتا ہے کہ زر نقد کی وہ مقدار جو کسی ملک میں متداول ہو حقوق کی اس مقدار کی علامت ہے جو زر نقد کی عدم موجودگی کی صورت میں اس ملک کے درمیان واجب الادا ہوتی یا بطور نتیجہ یوں کہو کہ جس ملک میں یہ حقوق نہیں ہیں وہاں کسی معیار قدر کے تداول کی ضرورت نہیں ہے۔

زر نقد کی ماہیت کی مزید توضیح کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اعتبار یا ساکھ کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں۔ ساکھ کیا ہے؟ فرض کرو کہ مجھے ایک شے کی ضرورت ہے، لیکن اس کی خرید کے لیے میرے پاس روپیہ موجود نہیں ہے۔ اگر اس شے کے بیچنے والوں کی نگاہوں میں میں ایک معتبر آدمی ہوں تو وہ لوگ میرے اعتبار پر مجھ کو میری ضرورت کی چیز دے دیں گے۔ گویا میں اپنے اعتبار کی وساطت سے وہ شے حاصل کر لوں گا جو زر نقد کی وساطت سے حاصل ہوتی۔ بالفاظ دیگر یوں کہہ دو کہ وعدۂ ادائیگی بھی وہی کام دے سکتا ہے جو زر نقد دیتا ہے جس طرح زر نقد کی ادائیگی ایک قسم کے حق کا تحویل کرنا ہے اسی طرح اعتبار کی وساطت سے اشیاء ضرورت کا حاصل کرنا بھی ایک حق کا تحویل کرنا ہے۔ یعنی جس شخص سے میں نے کوئی شے اعتبار پر لی ہے۔ اگر عند الطلب یا کسی مقررہ میعاد کے بعد اس کو کوئی مساوی القدر شے اس شے کے تبادلے یا مبادلے میں نہ دوں گا تو اس شخص کو یہ حق ہو گا کہ وہ قانونی چارہ جوئی کر کے مجھ سے وہ رقم یا شے وصول کر لے۔ مختصراً یوں کہو کہ زر نقد کی طرح اعتبار بھی قوت خرید کا نام ہے اور دونوں ایک قسم کے حقوق ہیں۔ اس تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ زر نقد اور اعتبار کی ماہیت ایک ہی ہے اور زر نقد اعتبار ہی کی ایک وسیع اور عام تر صورت کا نام ہے۔ لیکن باوجود اس امر کے ان کے درمیان ایک باریک فرق ہے، جس کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ علم الاقتصاد میں تمام زر نقد اعتبار ہے۔ لیکن اس قضیے کا عکس

سادہ یعنی تمام اعتبار زر نقد ہے صحیح نہیں ہے۔ کوئی شخص کسی دکاندار کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی شے کو زر نقد کے عوض میں یا اعتبار پر فروخت کرے۔ پس جب کوئی شخص کسی شے کے عوض میں زر نقد یا روپے کی کوئی مقدار لیتا ہے تو حقیقت میں یہ اعتبار ہی کی ایک صورت ہوتی ہے۔ کیوں کہ اگر اسے یقین نہ ہو کہ میں اس زر نقد کے عوض میں اور اشیاء لے سکوں گا تو وہ اس زر نقد کو کبھی قبول نہ کرے۔ مگر فرض کرو کہ ایک سودا ہوا ہے۔ یعنی ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے کوئی شے قرض خریدی ہے۔ عدل اس امر کا متقاضی ہے کہ مقروض کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اپنے قرض خواہ کو اپنے قرض کی ادائیگی میں کوئی شے قبول کرنے پر مجبور کر سکے۔ اگر قرض خواہوں کو یہ اختیار ہوتا کہ اپنے قرضوں کی ادائیگی میں جو شے چاہیں قبول کریں تو خیال کرو کس قدر دقت کا سامنا ہوتا۔ پس ہر ملک کا قانون یہ اصول وضع کرتا ہے کہ اگر کسی نے کچھ قرض لیا ہو تو مقروض اپنے قرض کی ادائیگی میں اپنے قرض خواہ کو کوئی خاص شے قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ خاص شے جس کو ادائیگی قرض کی صورت میں مقروض قرض خواہ کو قبول کرنے پر مجبور کر سکتا ہے، اصطلاحاً نقد قانونی کہلاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ ظاہر ہے کہ بعض صورتوں میں بعض اشیاء نقد قانونی ہیں اور بعض میں نہیں۔ انگلستان میں سکہ طلائی ہر صورت میں نقد قانونی ہے۔ لیکن چاندی کا سکہ صرف ۴۰ شلنگ تک ہی نقد قانونی ہے یعنی اگر قرض ۴۰ شلنگ سے زیادہ ہو تو قرض خواہ کو اختیار ہے کہ اس سکے کو قبول نہ کرے۔ اگر اس سے کم ہو تو مقروض اسے قانوناً مجبور کر سکتا ہے کہ وہ سکہ سیمیں کو اپنے قرض کی ادائیگی میں قبول کرے۔ مندرجہ بالا تحقیقات سے واضح ہوتا ہے کہ زر نقد تجارت اقوام میں تین ضروری مقاصد کو پورا کرتا ہے:

۱- تبادلۂ اشیاء کا ایک وسیلہ ہے۔ جوں جوں تجارت اقوام زیادہ پیچیدہ صورتیں اختیار کرتی جاتی ہے توں توں زر نقد کے استعمال کا یہ مقصد زیادہ واضح اور نمایاں ہوتا جاتا ہے جیسا کہ ہم اُوپر لکھ آئے ہیں تبادلۂ اشیاء کے لیے اس کا وجود ایسا ہی ضروری ہے جیسا اظہار خیالات کے لیے زبان کا استعمال۔ تمام ملکوں میں ٹکسالیں قائم ہیں جہاں ارکانِ سلطنت کے اہتمام

سے سونے چاندی کے سکے بنائے جاتے ہیں اور ان کی ہر دو طرف وہاں کے شاہی نشانات وغیرہ لگائے جاتے ہیں اور ان سکوں کے بل پر دنیا کی تجارت کا دھندا چلتا ہے۔

۲- زرنقد کا دوسرا مقصد پہلے مقصد سے بطور نتیجے کے پیدا ہوتا ہے۔ یعنی یہ اشیاء کی قدر کا معیار ہے۔ لیکن یہاں ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے۔ یعنی زرنقد کی ذاتی قدر کس امر پر منحصر ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پیشتر یہ ضروری ہے کہ ہم اصطلاح ''زرنقد کی قدر'' کا مفہوم ذہن نشین کرلیں۔ کیونکہ مل صاحب نے اس اصطلاح کے سمجھنے میں ایک غلطی کھائی ہے، جو اوروں کو بھی دھوکے میں ڈال سکتی ہے۔ تم کو معلوم ہے کسی شے کی قیمت سے مراد اس شے کی قدر سے ہے جس کا اندازہ زرنقد یا اعتبار سے کیا جاتا ہے۔ پس زرنقد کی قدر سے مراد کسی اور شے سے ہے جو اس زرنقد کے عوض میں دی جائے۔ مثلاً کوئی مادی شے یا خدمت ملازمین یا کوئی اور حق ملکیت کا یا کوئی قرضہ وصول کرنے کا۔ اگر زرنقد کی ایک خاص مقدار کے عوض میں کسی شے کی بہت سی مقدار ملے تو ظاہر ہے کہ زرنقد کی قدر زیادہ ہے۔ کیونکہ اس کے عوض میں دیگر اشیاء کی زیادہ مقدار حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اگر اس کے عوض میں دیگر اشیاء کی کم مقدار حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ زرنقد کی قدر کم ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زرنقد کی قدر اور قیمت اشیاء کے درمیان نسبت معکوس ہے یعنی اگر زرنقد کی قدر زیادہ ہو تو قیمت اشیاء کم ہوتی ہے اور اگر قیمت اشیاء زیادہ ہو تو زرنقد کی قدر کم ہوتی ہے۔ لیکن مادی اشیاء کی طرح حقوق (مثلاً کسی شخص سے کوئی خاص رقم وصول کرنے کا حق وغیرہ) قرضے[1] اور اعتبارات بھی تجارت کے دائرہ میں لائے جاسکتے ہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ الف نے ب سے پانچ سو روپے قرض لیے ہیں۔ ممکن ہے کہ ج الف کو پانچ سو روپے سے کچھ کم رقم ادا کر کے اس سے حق وصولی قرضہ خرید لیوے اور میعاد مقررہ کے بعد یا

---

[1] یاد رکھنا چاہیے کہ قرض سے مراد کوئی خاص رقم یا زرنقد کی مقدار نہیں ہے جیسا کہ عوام خیال کرتے ہیں بلکہ علمی لحاظ سے اس لفظ کا مفہوم وہ حق طلب ہے جو قرض خواہ کو حاصل ہے یا وہ فرض ادائیگی ہے جو مقروض کے ذمے ہے۔ لہٰذا قرضوں کی خرید و فروخت سے مراد قرض خواہ یا مقروض کی حق طلب یا فرض ادائیگی کی خرید و فروخت سے ہے۔

عند الطلب ب سے پانچ سو روپے وصول کر لیوے۔ لہٰذا ان حقوق اور اعتبارات کی خرید و فروخت کے لیے بھی ویسا ہی پیمانہ مقرر ہے جیسا مادی اشیاء کی خرید و فروخت کے لیے جیسے غلہ کے لیے من کا پیمانہ، کپڑے کے لیے گز کا۔ اسی طرح سہولت کے لیے زر نا مسکوک کو بھی مختلف پیمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے جن کو سکے کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس قرضوں اور اعتبارات کی خرید و فروخت کے لیے بھی ایک پیمانہ مقرر ہے۔ یعنی مبلغ سو روپے وصول کرنے کا حق جو اب سے ایک سال بعد واجب الادا ہو گا۔ زر نقد کی وہ مقدار جو کسی قرض کا ایک پیمانہ خریدنے کے لیے ادا کی جائے۔ اس پیمانے کی قیمت نقد کہلاتی ہے اور اس کی خرید و فروخت کا بھی وہی حال ہے جو اور اشیاء کا۔ یعنی ایک پیمانہ قرض خرید کرنے کے لیے زر نقد کی مقدار یا قیمت نقد جس قدر کم ادا کرنی پڑے گی اسی قدر زر نقد کی قدر زیادہ ہو گی اور جس قدر زیادہ دینی پڑے گی اسی قدر اس کی قدر کم ہو گی۔ غرض کہ قرضوں اور دیگر حقوق کی خرید و فروخت میں بھی مندرجہ بالا اصول ہی صحیح ہے۔ یعنی زر نقد کی قدر اور قیمت اشیاء کے درمیان نسبت معکوس ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ قرضوں کی خرید و فروخت کی صورت میں معمولاً زر نقد کی قدر کا اندازہ قرضے کی اس مقدار سے نہیں کیا جاتا جو اس کے عوض میں خریدا جا سکے۔ چونکہ زر نقد قدرتاً منافع پیدا کرتا ہے۔ اس واسطے ظاہر ہے کہ کسی ایسے قرضے کی قیمت نقد جو اب سے ایک سال بعد واجب الادا ہو گا، اس قرضے کی اصل مقدار سے کم ہونی چاہیے ورنہ خریدنے والے کو فائدہ ہی کیا ہو گا۔ پس زر نقد کی قدر موجودہ یا قیمت نقد منفی اصل زر یا مقدار قرضہ برابر اس منافع کے ہے جو اس قرضے کے خریدنے سے ہوتا ہے۔ اس فرق کو مٹی کاٹا کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اب صاف ظاہر ہے کہ جس قدر کسی قرضے کی قیمت نقد بڑھتی یا کم ہوتی ہے اسی قدر مٹی کاٹا بھی کم ہوتا یا بڑھتا ہے۔ لہٰذا قرضوں کی خرید و فروخت کے متعلق یہ اصول قائم ہوا کہ زر نقد کی قدر اور مٹی کاٹا کے درمیان نسبت مستقیم ہے، یعنی قیمت نقد کم ہو تو مٹی کاٹا زیادہ ہو گا اور قیمت نقد زیادہ ہو تو مٹی کاٹا کم ہو گا۔ مندرجہ ذیل اصول تجارت کی سب شاخوں یعنی قرضوں اور دیگر حقوق کی خرید و فروخت اور اشیاء مادیہ کی خرید و فروخت پر حاوی ہے۔

زر نقد کی قدر قیمت اشیاء کے ساتھ نسبت معکوس رکھتی ہے اور مٹی کاٹا کے ساتھ نسبتِ مستقیم۔

اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہو گا کہ اصطلاح زر نقد کی قدر کے دو مفہوم ہیں۔ اشیاء مادیہ اور حقوق وغیرہ کی خرید و فروخت میں تو اس سے مراد قیمت شے یا حق وغیرہ کی اس مقدار سے ہے جو اس کے عوض میں حاصل کی جا سکے اور قرضوں کی خرید و فروخت میں اس کا مفہوم وہ مٹی کاٹا یا منافع ہے جو کسی شخص کو کوئی قرضہ خریدنے سے حاصل ہو۔

اس توضیح کے بعد ہم اپنے اصل سوال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اسی سوال کی وجہ سے زر نقد کی بحث تبادلے کی ذیل میں آتی ہے، ورنہ دیگر اشیاء کی طرح اس کا ذکر بھی باب پیدائش دولت میں کیا جاتا۔ صاف ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر دیگر اشیاء کی قدر کی طرح قانون طلب و رسد کے عمل سے متعین ہوتی ہے۔ تم جانتے ہو دنیا کی تجارت زر نقد کے بل پر ہی چلتی ہے۔ پس جس قدر استعمال زر نقد کے مواقع زیادہ ہوں گے، اسی قدر اس کی مانگ یا طلب بھی زیادہ ہو گی۔ ہاں جب زر نقد کا کام اور وسائل سے لیا جائے مثلاً چکوں وغیرہ سے، تو اس کی طلب کم ہو جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ زر کاغذی کا استعمال زر نقد کے مواقع استعمال کو کم کرتا ہے۔ کہیں اس غلطی میں نہ پڑ جانا کہ زر نقد کی مانگ یا طلب کا انحصار کسی قوم کی دولت یا اس کی سالانہ پیداوار دولت کی مقدار پر ہے۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر قسم کی دولت تجارت کے دائرے میں آوے۔ علیٰ ہذا القیاس اشیاء متبادلہ کی مقدار کو بھی اس مانگ سے کچھ واسطہ نہیں۔ کیونکہ بعض اشیاء کا تبادلہ صرف ایک ہی دفعہ ہوتا ہے اور بعض کا کئی کئی دفعہ ہوتا ہے۔ مزید برآں خصوصاً زراعتی ملکوں میں بسا اوقات افراد اپنا کام زر نقد کی وساطت کے بغیر مبادلۂ اشیاء سے ہی چلا لیتے ہیں۔ تم شاید یہ کہو گے کہ جب کسی ملک کا سکہ کھوٹا ہو کر یا کسی اور وجہ سے کم حیثیت ہو کر اپنا اعتبار کھو بیٹھتا ہے، تو وہاں کے لوگ اس سکے سے احتراز کرنے کی خاطر مبادلۂ اشیاء سے کام چلا لیتے ہیں یا ضرورت کی اشیاء ایک دوسرے سے بدل کر سکوں کے استعمال سے بچ جاتے ہیں۔ یہ خیال صحیح ہے مگر کسی ملک میں یہاں تک نوبت نہیں پہنچ سکتی کہ زر نقد کا استعمال بالکل جاتا رہے۔ ہر ملک میں بشرطیکہ وہاں کے لوگ وحشی نہ

ہوں، کچھ نہ کچھ بطور زر نقد کے ضرور مستعمل ہوتا ہے۔ پس زر نقد کی طلب کسی قوم کی دولت یا اس کی پیداوار اور دولت یا اشیاء متبادلہ کی مقدار سے کوئی تعلق نہیں رکھتی، بلکہ اس کا انحصار زر نقد کے مواقع استعمال پر ہے، جو خود مختلف ممالک کی تنظیم، محنت اور دیگر حالات پر منحصر ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ زر نقد کی مانگ یا طلب محض خیالی امر ہی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک حقیقت ہے۔ تم دیکھتے ہو، لوگ روپے کے عوض میں اپنی اشیاء فروخت کرتے ہیں۔ چیزیں دیتے ہیں اور ان کے عوض زر نقد قبول کرتے ہیں۔ رسد اشیاء کی ایک معین مقدار کی صورت میں جس قدر زیادہ اشیاء زر نقد کے عوض میں ملیں گی، اسی قدر زر نقد کی قدر زیادہ ہوگی یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں کم ہوں گی اور جس قدر کم اشیاء زر نقد کے عوض میں ملیں گی، اسی قدر زر نقد کی قدر کم ہوگی۔ یا یوں کہو کہ اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہو جائیں گی۔

زر نقد کی رسد گویا ایک قسم کی قوت ہے جو زر نقد کے تجارتی مقاصد کو پورا کرتی ہے اور جو اس کی مقدار اور سرعت انتقال سے متاثر ہوتی ہے۔ جس قدر زر نقد کی مقدار زیادہ ہوگی اور جس قدر عجلت سے یہ مقدار دست بدست پھر سکے گی، اسی قدر تجارتی مقاصد باحسن وجوہ اتمام پائیں گے۔ اگر زر نقد کی رسد کم ہو جائے تو اشیاء کی قیمتیں کم ہو جائیں گی کیونکہ رسد کی کمی سے زر نقد کی قدر بڑھ جائے گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر رسد زیادہ ہو جائے تو اشیاء کی قیمتیں زیادہ ہو جائیں گی کیونکہ اس صورت میں زر نقد کی قدر کم ہو جائے گی اور اس کے عوض میں اشیاء کی زیادہ مقدار ہاتھ لگے گی۔

اب ہم زر نقد کے متعلق ایک اور ضروری امر دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی مختلف ممالک اور اقوام کے درمیان زر نقد کی مساوی تقسیم کس طرح ہوتی ہے؟ زر نقد خود بخود ایک ملک سے دیگر ممالک میں منتقل ہوتا ہے اور اس وجہ سے اس کی تقسیم مساوی طور پر ہو جاتی ہے۔ فرض کرو کہ کسی ملک (الف) میں زر نقد کی مقدار وہاں کے لوگوں کی ضرورتوں سے زیادہ ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ وہاں اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ کیونکہ زر نقد کی زیادتی سے اس کی قدر کم ہو جائے گی۔ اس صورت میں ب اپنی اشیاء ملک الف میں بھیجے گا۔ کیونکہ وہاں قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے فائدے کی توقع ہے۔ اس طریق سے زر نقد ملک الف سے ملک

ب کی طرف منتقل ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ دونوں ملکوں میں اس کی مقدار مساوی ہو جائے گی۔ لیکن ملک الف میں زر نقد کی افراط کی وجہ سے ایک اور نتیجہ بھی پیدا ہو گا۔ یعنی چونکہ اس کی قدر افراط کے سبب سے کم ہو گی، اس واسطے عام لوگوں کو زر نقد کے جمع کرنے کی تحریک ہو گی۔ مختلف اقسام کی صنعتوں میں چاندی یا سونے کا استعمال (جیسی صورت ہو) بڑھتا جائے گا۔ چاندی کے گلاس، حقوں کی منہالیں وغیرہ عام ہو جائیں گی۔ مزید برآں وہاں کے لوگ سکوں کو پگھلا کر زرنامسکوک کی صورت میں ان ممالک کی طرف بھیجنا شروع کر دیں گے جہاں سونے چاندی کی قدر زیادہ ہے۔ ایسے حالات میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر فرضاً ملک الف میں کھرے سکے کے ساتھ ایک کھوٹا یا کم وزن کا سکہ بھی جاری ہو (تم جانتے ہو مختلف ممالک کے سکوں میں کم و بیش اختلاف ہوتا ہے۔ اکثر سکے استعمال سے ہلکے ہو جاتے ہیں) تو ان دونوں میں سے کسی سکے کو جمع کرنے یا پگھلانے یا دیگر ممالک میں بھیجنے کی تحریک ہو گی؟ چونکہ اس ملک میں زر نقد کی افراط ہم نے فرض کرلی ہے، اس واسطے ظاہر ہے کہ جو سکہ کھرا یا پورے وزن کا ہو گا لوگ اسی کو جمع کریں گے یا پگھلا کر دیگر ممالک میں بھیجیں گے۔ کھوٹے یا کم وزن سکوں کی نسبت خالص اور پورے وزن کے سکوں کا جمع کرنا یا دیگر ممالک کو بھیجنا زیادہ فائدہ مند ہو گا۔ کیونکہ دیگر ممالک میں سکوں کی قدر دھات کی اس مقدار سے متعین ہوتی ہے جو ان میں شامل ہو۔ اسی صداقت کو گریشم صاحب ایک اقتصادی اصول کی صورت میں یوں پیش کرتے ہیں کہ کھوٹا یا ہلکا سکہ کھرے سکے کو دائرۂ استعمال سے خارج کر دیتا ہے اور خود اس کی جگہ لے لیتا ہے۔

مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اصول اسی صورت میں صادق آئے گا، جب کہ کسی ملک میں زر نقد کی مقدار لوگوں کی ضرورت سے زیادہ ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہلکے یا کھوٹے سکوں اور کھرے سکوں کی قوت خرید میں کوئی فرق نہ ہو گا۔ یہ کلیہ مندرجہ ذیل حالات پر صادق آتا ہے۔

الف- اگر کسی ملک میں صرف ایک دھات سونے یا چاندی کا کھرا سکہ متداول ہو اور اُس کے ساتھ کوئی مغشوش کھوٹا یا ہلکا سکہ بھی متداول رہنے دیا جائے تو کچھ عرصے میں کھرے سکے کی تمام مقدار دائرۂ استعمال سے خارج ہو جائے گی اور صرف کھوٹا سکہ ہی استعمال

میں رہے گا۔ کھرے سکے کو یا تو لوگ جمع کرتے جائیں گے یا پگھلا کر رکھتے جائیں گے یا دیگر ممالک سے اشیاء ضرورت کے خریدنے میں صرف کرتے جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی ملک میں گز کے دو پیمانے جاری ہوں ایک تین فٹ اور ایک دو فٹ کا تو کپڑے کے دکاندار قدرتاً دو فٹ والے پیمانے کے حساب سے اپنا کپڑا فروخت کریں گے۔ یعنی دو فٹ والا گز تین فٹ والے گز کو دائرۂ استعمال سے خارج کر دے گا۔

ب- اگر کسی ایک ملک میں دو مختلف دھاتوں مثلاً سونے اور چاندی کے سکے ایک غیر محدود مقدار میں اکٹھے متداول ہوں اور قانونی طور پر ان کے درمیان ایک ایسی نسبت مقرر کر دی جائے جو ان کی حقیقی قدروں کی درمیانی نسبت سے مختلف ہو (یعنی کم یا زیادہ ہو) تو جس سکے کی قدر اس کی حقیقی قدر سے کم ہو گی وہ دائرۂ استعمال سے خارج ہو جائے گا اور جس کی زیادہ ہو گی وہی متداول رہے گا۔ مثال کے طور پر فرض کرو کہ ایک ملک میں دو سکے غیر محدود مقدار میں متداول ہیں۔ ایک سونے کی مہر اور دوسرا چاندی کا روپیہ اور ان کی اضافی قدر اس طرح پر ہے کہ ایک مہر مساوی بیس روپے کے ہے۔ نیز فرض کرو کہ مہر کی قانونی قدر بیس روپیہ ہے یا بالفاظ دیگر بیس روپے کو چلتی ہے لیکن اس میں سونا اٹھارہ روپے کا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس چاندی کے روپے کی قانونی قدر اس کی حقیقی قدر سے کم ہے تو اس صورت میں اصول مندرجہ بالا کی رو سے روپیہ کا سکہ دائرۂ استعمال سے خارج ہو جائے گا اور صرف مہر متداول رہے گی۔ لوگ اپنی خرید و فروخت اور قرضوں کی ادائیگی قدرتاً مہر کی وساطت سے کریں گے۔ کیونکہ اس کی اصل قدر تو اٹھارہ روپے ہے اور کام بیس روپے کا دیتی ہے۔ چاندی کے سکوں کو لوگ پگھلا کر زر نامسکوک کی صورت میں جمع کریں گے یا دیگر ممالک میں بھیجیں گے۔ کیونکہ ان کی قدر دھات کی اس مقدار سے متعین ہو گی جو ان میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۷۶٦ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال میں چاندی کے سکے کے ساتھ سونے کا سکہ بھی جاری کیا، تو اس کارروائی میں ناکامیابی ہوئی اور سکہ مذکور چل نہ سکا۔ کیونکہ کمپنی کی مہر کی قانونی قدر چودہ روپیہ کے برابر مقرر کی گئی تھی، جو اس کی حقیقی قدر سے بہت کم تھی۔ ۱۷۶۹ء میں کمپنی مذکور نے پھر ایک طلائی مہر جاری کی لیکن پھر ناکامی ہوئی۔ آخر کار یہ فیصلہ

ہوا کہ بنگال میں صرف ایک ہی دھات کا سکہ متداول رہنا چاہیے اور اس غرض کے لیے چاندی انتخاب کی گئی۔ اب کچھ عرصہ سے سرکار ہند نے اس ملک میں سونے کا سکہ بھی متداول کر دیا ہے جس کی وجہ ابھی معلوم ہو گی۔

ج– مندرجہ بالا دو مقدمات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر ایک ملک میں سونے کا سکہ متداول ہو اور دوسرے میں چاندی کا، تو ان کے درمیان ایک ہی نسبتِ تبادلہ قائم نہیں رہ سکتی۔ بلکہ چاندی اور سونے کی قیمت کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے وجہ یہ ہے کہ سکے خواہ سونے کے ہوں خواہ چاندی کے ہوں، خارجی ممالک میں اپنی حقیقی قدر کے لحاظ سے قبول کیے جاتے ہیں۔ ہمارے ملک کے روپے کی حقیقی قدر صرف گیارہ آنے کے برابر ہے۔ اگرچہ قانوناً اس کی قدر سولہ آنے کے برابر مقرر کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان میں تو ہر شخص اسے سولہ آنے کے عوض میں قبول کرے گا۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ دیگر ممالک کے لوگ بھی اس کے عوض میں سولہ آنے ہی دیں۔ وہ اس کے بدلے اس کی حقیقی قدر یعنی گیارہ آنے ہی ادا کریں گے۔

یہ کلیہ اصول جو ہم نے بیان کیا ہے علم الاقتصاد کی کتابوں میں قانونِ گریشم کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کے نتائج بڑے اہم ہیں اور یہ ایک بڑی ضروری اقتصادی بحث میں کام آتا ہے۔ محققین کے درمیان یہ بحث مدت سے چلی آتی ہے کہ آیا تمام دنیا کے ممالک کو یا کسی ایک ملک کو ایک ہی دھات کا سکہ بطور معیار قدر کے متداول رکھنا چاہیے یا اقتصادی لحاظ سے دو مختلف دھاتوں کے سکے بطور معیار قدر کے اکٹھے متداول رہ سکتے ہیں۔ ایک فریق تو یہ کہتا ہے کہ تمام ممالک یا کسی ایک ملک میں اصل معیارِ قدر تو ایک ہی رہنا چاہیے جس سے سرکار اور تجارت کے بڑے بڑے معاملے طے ہوا کریں لیکن روز کی معمولی چھوٹی چھوٹی خرید و فروخت کے لیے اور دھاتوں کے سکے متداول رہنے چاہییں۔[1] دوسرا

[1] یاد رکھنا چاہیے کہ کسی ملک میں دو یا دو سے زیادہ مختلف دھاتوں کے سکّوں کا متداول ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ یہ سب سکے بطور معیار قدر کے مستعمل ہوتے ہیں۔ یہ تمام سکے معیار قدر اسی صورت میں سمجھے جائیں گے جہاں رعایا کو یہ حق حاصل ہو کہ جب چاہے کسی دھات کی کچھ مقدار دے کر سرکاری ٹکسال سے متداول سکّے بنوا لے۔

فریق یہ کہتا ہے کہ دو مختلف دھاتوں کے سکے بطور معیارِ قدر کے متداول رہ سکتے ہیں اور رہنے چاہییں۔

اس طریق عمل میں اقتصادی لحاظ سے کوئی نقصان نہیں ہے۔ بشرطیکہ مختلف ممالک اتفاق کر کے دونوں دھاتوں کی اضافی قدروں کے درمیان ایک خاص نسبت مقرر کر دیں۔ اس طویل مگر ضروری بحث کو ہم یہاں چھیڑنا نہیں چاہتے، لیکن اس قدر ظاہر ہے کہ قانون مذکورہ بالا کی رو سے دونوں دھاتوں کی اضافی قدروں کے درمیان کوئی نسبت مقرر نہیں رہ سکتی بلکہ چاندی اور سونے کی قدروں کے تغیر کے ساتھ ساتھ متغیر ہوتی رہتی ہے۔ تم شاید یہ کہو گے کہ سرکار ہند نے اس صحیح اصول کے خلاف کیوں عمل کیا ہے؟ یعنی ہندوستان میں کیوں دو معیار قدر جاری ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سونے کا سکہ عام استعمال کے لیے نہیں ہے۔ ہم پہلے اشارۃً ذکر کر آئے ہیں کہ ہمیں انگلستان کو جو رقم سالانہ ادا کرنی پڑتی ہے، وہ پونڈوں کے حساب سے دینی ہوتی ہے۔ اس واسطے جب چاندی کی قدر میں کسی باعث سے کمی ہو جاتی تھی (بالعموم سونے کی نسبت چاندی کی قدر میں زیادہ تغیر آتے ہیں) تو ہمارے ملک کی مالگذاری کو نقصان پہنچتا تھا۔ کیونکہ جہاں پہلے ایک پونڈ کے عوض دس روپے دینے پڑتے تھے، چاندی کی قدر کے کم ہو جانے کی وجہ سے ایک پونڈ کے عوض میں ۱۵ روپے دینے پڑتے تھے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے تاجروں کو بھی نقصان پہنچتا تھا۔ اسی دقت کو محسوس کر کے ہماری سرکار نے یہاں بھی سونے کا سکہ جاری کر دیا۔ چونکہ یہ سکہ عام طور پر مستعمل نہیں ہے اور ہو ہی کس طرح سکتا ہے؟ کیونکہ اس ملک کے لوگ اس قدر غریب ہیں کہ یہاں کوڑیاں بھی بطور سکے کے مستعمل ہوتی ہیں۔ اس واسطے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے ملک میں ایک ہی معیار قدر یعنی چاندی کا روپیہ جاری ہے۔ اس طریق عمل سے ہم ان نقصانات سے جو ایک ہی معیار قدر کے تداول سے پیدا ہوتے ہیں مامون ہیں۔ لیکن وہ بڑے بڑے فوائد جو دو معیار قدر کے تداول سے پیدا ہوتے ہیں ہمیں حاصل ہیں۔

۳- تیسرا مقصد زر نقد کا یہ ہے کہ نقد مذکور ادائیگی غیر مؤجل کا معیار ہے۔ فرض کرو کہ الف اور ب نے آپس میں ایک معاہدہ کیا ہے۔ الف نے ب کو کسی قسم کا سامان دیا ہے اور

ب اس کے عوض میں معاہدہ کرتا ہے کہ بیس سال کے بعد دس ہزار روپیہ اس سامان کے عوض میں ادا کرے گا۔ فرض کرو کہ اس عرصہ میں روپیہ کی قدر میں ایک بہت بڑا تغیر آگیا ہے، یعنی جو چیز معاہدہ کے وقت آٹھ آنے کو بکتی تھی، اب ایک روپیہ کو ملتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ قرض کی ادائیگی میں الف گھاٹے میں رہے گا اور ب بہت فائدہ میں۔ اس قسم کی اور صورتوں کے لحاظ سے یہ ضروری ہے کہ معیار قدر کوئی ایسی شے ہونی چاہیے جس کی قدر میں تغیر نہ آتا ہو یا کمی بیشی نہ ہوتی ہو۔ ایسی شے تو شاید دنیا بھر میں کوئی نہ ملے۔ ہاں بعض اشیاء کی قدر میں دیگر اشیاء کی نسبت کم تغیر آتا ہے انھی میں سے سونا اور چاندی دو دھاتیں ہیں، جو بالعموم اپنی قدر میں یکساں رہتی ہیں۔ اگرچہ بعض دفعہ ان کی قدر میں بھی تغیر ہو جانے سے دقتوں کا سامنا ہوا ہے۔ تاہم نسبتاً ان کی قدر تغیر سے آزاد رہتی ہے۔ لہٰذا یہ ان قرضوں کی ادائیگی کی صورت میں بھی کام دے سکتے ہیں جن میں مدت کو دخل ہے۔ بعض محققین ان مشکلات سے بچنے کے لیے جو زر نقد کی قدر کے تغیر سے پیدا ہوتی ہیں یہ تجویز کرتے ہیں کہ ادائیگی غیر معجل یا ایسی ادائیگی کی صورت میں جس میں مدت کو دخل ہے، معیار قدر غلہ کو قرار دینا چاہیے۔ مگر یہ رائے قرین صواب نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ عام لوگوں کو سونے چاندی کے ساتھ ایک خاص قسم کا انس اور دل بستگی پیدا ہو گئی ہے، جس کا دور کرنا مشکلات سے ہے۔ بعضوں نے ان مشکلات سے بچنے کی اور تجاویز بھی پیش کی ہیں، جن کا اس کتاب میں بیان کرنا کچھ ضروری معلوم نہیں ہوتا۔

باب چہارم

حق الضرب

اس باب میں ہم ایک ایسے سوال پر بحث کرنا چاہتے ہیں جس کا فیصلہ گذشتہ اقتصادی اصولوں پر انحصار رکھتا ہے لیکن مبتدی کو خبر دار رہنا چاہیے کہ یہ سوال نہایت پیچیدہ ہے اور اس کا پورا مفہوم سمجھنے میں بڑے بڑے غلط استدلالات سے کام لیا گیا ہے۔ لہٰذا اس خارستان میں قدم رکھنے سے پیشتر اپنا دامن سنبھال لینا چاہیے اور ان تمام گڑھوں سے واقف ہو جانا چاہیے، جنہوں نے دنیا کے بڑے بڑے تجربہ کار منطقیوں اور مصنفوں کو منہ کے بل گرا دیا ہے۔ ایک محقق تحریر فرماتے ہیں کہ جو مصنف زر نقد کے خطرناک مضمون کو چھوتا ہے، وہ ہر لحظہ معرض خطر میں ہے کیونکہ استدلالی اغلاط شیر اور چیتوں کی طرح اس کے گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اس اندیشہ کو مد نظر رکھ کر ہم اس بحث کو ایک اقتصادی اصطلاح کی تشریح سے شروع کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس دقیق مضمون کی تفہیم کے لیے یہی راہ آسان اور محفوظ معلوم ہوتی ہے۔ مبتدی کو لازم ہے کہ ہر جملے اور اصطلاح کے معانی کامل طور پر ذہن نشین کرتا جائے، ورنہ وہ اس اہم اقتصادی بحث کی غرض و غایت اور اس کے نتائج سے پوری آگاہی حاصل نہ کر سکے گا۔

ہر ملک میں یہ امر قانونی طور پر فیصلہ پاتا ہے کہ زر نامسکوک یا سونے چاندی کی کسی خاص مقدار کے کس قدر سکّے گھڑے جائیں۔ مثلاً انگلستان کے موجودہ قانون کی رُو سے ۴۰ پونڈ سونے کے ۱۸۶۹ سکّے بنائے جاتے ہیں، جو ساورن کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ سکّوں کی یہ تعداد جن میں زر نامسکوک کی کوئی مقدار قانوناً منقسم کی جاتی ہے اس مقدار کی قیمت ضربی کہلاتی ہے۔ اس تعریف سے ظاہر ہے کہ جب تک کوئی سکّہ قانونی لحاظ سے پورے وزن کا ہو اس کی قدر ہمیشہ اپنے وزن زر نامسکوک کی قدر کے مساوی ہوتی ہے۔ لیکن

ظاہر ہے کہ کچھ عرصہ کے روز مرّہ استعمال سے سکوں کا وزن قانونی وزن سے کم ہو جاتا ہے۔ بالعموم خرید و فروخت میں لوگوں کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ کوئی سکہ وزن کا پورا ہے یا کم ہے۔ اس واسطے ممکن ہے کہ بہت عرصہ تک متداول رہنے سے بعض سکّوں کا وزن قانونی وزن سے کم ہو جائے اور بیع و شریٰ میں ان کی قدر وہی تصور کی جائے جو قانوناً مقرر ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی سکّے میں سولہ آنے کی چاندی ہے اور سولہ آنے کو ہی چلتا ہے۔ ممکن ہے کہ کثرت استعمال سے اس کا وزن کم ہو جائے یعنی اس کی چاندی پندرہ آنے کی رہ جائے لیکن بیع و شریٰ میں سولہ آنے کو ہی چلتا رہے۔ عام خرید و فروخت میں سکّوں کے وزن کی کمی کچھ اثر نہیں کرتی۔ لیکن جب ان کا تبادلہ زر نامسکوک سے کیا جائے تو یہ اثر ظاہر ہوتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں زر نامسکوک سی قدر ملے گی جس قدر سکّوں کا موجودہ وزن ہے۔ اگر کثرت استعمال سے ان کا وزن قانونی وزن سے کم ہو گیا ہے تو ظاہر ہے کہ زر نامسکوک کی کوئی خاص مقدار تبادلے میں لینے کے لیے سکوّں کی زیادہ تعداد دینی پڑے گی۔ پس متداول سکوّں کی وہ تعداد جو حقیقی طور پر زر نامسکوک کی کسی مقدار کی ہم وزن ہے۔ مقدار مذکور کی قیمت متعارف کہلاتی ہے اور چونکہ کمی وزن کی صورت میں زر نامسکوک کی کسی مقدار کے عوض میں متداول سکوّں کی زیادہ تعداد دینی پڑتی ہے۔ اس واسطے ظاہر ہے کہ قیمت متعارف قیمت ضربی سے زیادہ ہوگی۔ مثلاً فرض کرو کہ چاندی کی قیمت ضربی پانچ شلنگ دو پنس فی اونس ہے اور قیمت متعارف چھ شلنگ ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ سکّہ متداول کے چھ شلنگ زر نامسکوک کی مقدار کے ہم وزن ہیں، جس کا ہم وزن پانچ شلنگ دو پنس کو ہونا چاہیے تھا، اگر ان کا وزن کثرت استعمال کے باعث قانونی وزن سے کم نہ ہو جاتا۔ لہٰذا ظاہر ہے کہ زر نامسکوک کی قیمت متعارف کا اس کی قیمت ضربی سے بڑھ جانا سکّے کی کم قدر ہو جانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس توضیح سے سکّہ زنی کے متعلق دو ضروری اصول پیدا ہوتے ہیں۔

الف-جب زر نامسکوک کی قیمت متعارف اس کی قیمت ضربی سے بڑھ جاتی ہے، تو اس سے صرف یہی ثابت نہیں ہوتا کہ سکّے کی قدر کم ہو گئی ہے، بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سکّہ مذکور کی قدر کہاں تک کم ہوئی ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ (زر نامسکوک کی قیمت متعارف

زر نامسکوک کی قیمت ضربی =)اس وزن کے ہے جو سکّہ متداول کی کثرت استعمال سے زائل ہو گیا ہے۔

ب- قیمت ضربی کی تعریف سے مندرجہ ذیل اصول بطور نتیجے کے پیدا ہوتا ہے۔ زر نامسکوک کی قیمت ضربی کا بدلنا حقیقت میں سکوّں کے قانونی وزن کا بدلنا ہے۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ زر نامسکوک کی قیمت ضربی مختلف حالات میں مختلف ہو سکتی ہے، تو یہ صریحاً غلط ہے۔ کیا اگر ایک من شراب کو جو کسی مٹکی میں رکھی ہو، بہت سی بوتلوں میں ڈال دیا جائے تو شراب کی مقدار بدل جائے گی؟ ہر گز نہیں۔ بہت سے حصوں میں منقسم ہو جانے سے اس کی مقدار میں فرق نہیں آسکتا۔

اس تشریح کے بعد اب ہم اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ تم کو شاید معلوم ہے کہ سرکار سکّہ زنی کے متعلق ایک خاص قسم کا حق رکھتی ہے جس کو حق الضرب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس حق سے مراد زر نامسکوک کی اس مقدار سے ہے جو سرکار بطور مصارف سکہ زنی کے لیتی ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک روپے کے مصارف سکّہ زنی دو آنے ہیں۔ سرکاری ٹکسال دو آنے وضع کرنے کی خاطر روپے میں چودہ آنے کی چاندی ڈال کر اپنے مصارف سکّہ زنی نکال لے گی۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حق الضرب دو قسم کا ہوتا ہے۔

ا- جب کہ حق الضرب مصارف سکّہ زنی کے برابر ہو۔ اس صورت میں سرکار کو کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ جس قدر سرکار کا خرچ ہوتا ہے اسی قدر اسے ملتا ہے۔ بعض ممالک میں حق الضرب بالکل نہیں لیا جاتا۔ مثلاً انگلستان کی ٹکسال پونڈ میں پورے بیس شلنگ کی قیمت کا سونا ڈالتی ہے۔ بعض ممالک میں رعایا کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ حق الضرب ادا کرکے یا اس کے بغیر جیسا قانون ہو سرکاری ٹکسال سے اپنے سونے یا چاندی کے ٹکڑے سکوّں کی صورت میں منتقل کروالے۔ چنانچہ انگلستان میں سونے کے سکوّں کے متعلق رعایا کو یہ حق حاصل ہے کہ بغیر حق الضرب ادا کرنے کے سونے کے ٹکڑوں کو ٹکسال سے پونڈوں کی صورت میں منتقل کروالیں۔ ۱۸۹۴ء سے پہلے ہندوستان کی رعایا کو بھی یہ حق حاصل تھا۔

اب کسی خاص مصلحت کی وجہ سے جس کا ذکر ابھی آئے گا۔ اس ملک کی ٹکسال رعایا کے لیے بند ہے اور سرکار صرف اسی قدر سکّے بناتی ہے جس قدر اس ملک کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔

۲- جب کہ حق الضرب مصارف سکّہ زنی سے زیادہ ہو۔ اس صورت میں سرکار سکّہ زنی سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہندوستان میں روپیہ سولہ آنے پر چلتا ہے۔ حالانکہ اس میں چاندی صرف گیارہ آنے کی ہوتی ہے۔ گویا سرکار کو فی روپیہ پانچ آنے فائدہ ہوتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ایک پیسے میں تانبا شاید سات کوڑی کا بھی نہ ہوتا ہو۔ ہم ان دونوں طریقوں پر بالترتیب بحث کریں گے۔

اوّل صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا کسی سکّے کی قدر زر نامسکوک کی اس مقدار کی قدر کے مساوی ہونی چاہیے جو اس سکّے میں شامل ہے۔ یا مقدار مذکور کی قدر میں مصارف سکّہ زنی بھی شامل ہونے چاہییں۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر ایک روپیہ کے مصارف سکّہ زنی دو آنے ہوں۔ تو کیا روپے میں ۱۴ آنے کی چاندی ڈال کر اس کی قدر ۱۶ آنے کی برابر ہی مقرر کرنی چاہیے یا ۱۶ آنے کی چاندی ڈال کر اس کی قدر ۱۶ آنے کے برابر ہی مقرر کرنی چاہیے۔ ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں سرکار کو اپنے مصارف سکّہ زنی کی بابت ۲ آنے مل جائیں گے۔ مگر دوسری صورت میں یعنی جب کہ روپے میں ۱۶ آنے کی چاندی ہو سرکار کو بطور مصارف سکّہ زنی کچھ نہیں ملے گا۔ یہ ایک بحث طلب معاملہ ہے۔ بعض حکماء کہتے ہیں کہ سرکار کو کچھ حق ضرب نہ لینا چاہیے۔ یا یوں کہو کہ ان کے نزدیک مصارف سکّہ زنی کی خاطر اس کی حقیقی قدر سے زیادہ قدر پر چلانا اقتصادی لحاظ سے مضر ہے۔ مگر بعض حکماء کے نزدیک مصارف سکّہ زنی کے برابر حق ضرب لے لینے میں کوئی ہرج نہیں۔ ان کے دلائل مفصلاً ذیل ہیں:

۱- ایک قینچی کی قیمت اس کے ہم وزن لوہے کی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے، اس واسطے کوئی وجہ نہیں کہ کسی سکّے کی قدر اپنے ہم وزن زر نامسکوک کی قدر سے زیادہ نہ ہو۔ سونا یا چاندی اپنی نامسکوک حالت میں اس قدر مفید نہیں ہوتے، جس قدر کہ سکّوں کی صورت میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا عقل اس امر کی متقضی ہے کہ جب زر نامسکوک سکّوں کی صورت میں منتقل

کر دیا جائے، تو اس کی قدر بھی بڑھ جائے گی، جیسا کہ لوہے کے ٹکڑے کی قدر ایک زنجیر یا تلوار کی صورت میں منتقل ہو جانے سے بڑھ جاتی ہے۔

۲- اگر کوئی حق ضرب نہ لیا جائے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر سکّے کی قدر زر نامسکوک کی قدر کے برابر ہو جو اس میں شامل ہے، تو عوام کو جب زر نامسکوک کی ضرورت لاحق ہو گی سکّوں کو پگھلا لیا کریں گے اور جب سکّوں کی ضرورت ہو گی اسی زر نامسکوک کو سرکاری ٹکسال سے پھر سکّوں کی صورت میں منتقل کرا لیا کریں گے۔ یہ عمل بار بار ہوتا رہے گا جس سے سرکار کو بے جا نقصان ہو گا۔ کیونکہ سرکار کو بغیر مصارف سکّہ زنی لینے کے سکّے بنانے پڑیں گے۔ یہ دلیل واقعی زبردست ہے مگر باوجود اس بات کے دنیا کے بعض بڑے بڑے تجارتی ملک مثلاً انگلستان وغیرہ حق ضرب نہیں لیتے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں بھی ایک فائدہ ہے اور وہ یہ ہے کہ جب انگلستان میں سکّے کی مقدار تجارتی ضرورتوں سے زیادہ ہو جاتی ہے (تجارتی ملکوں میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے) تو اس افراط کے باعث ان کی قدر کم ہونے نہیں پاتی۔ یا یوں کہو کہ انگلستان میں اشیاء کی قیمتیں زیادہ نہیں ہونے پاتیں کیونکہ سکّوں کی یہ غیر ضروری مقدار فوراً دیگر ممالک کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتی ہے اور دیگر ممالک کے لوگوں کو اس کے قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عذر تو اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ اس کی قدر اپنے ہم وزن زر نامسکوک کی قدر سے زیادہ ہو۔ دیگر ممالک کے نزدیک جیسا زر نامسکوک ویسا انگلستان کا زر مسکوک۔ مثلاً اگر کابل کے سکّے میں دس آنے کی چاندی ہو اور وہ دس آنے پر ہی چلتا ہو۔ یا یوں کہو کہ کابل حق ضرب نہ لیتا ہو، تو ہندوستان کے لوگوں کو بشرطیکہ ان کو چاندی کی ضرورت ہو، اُسے دس آنے پر خریدنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ غرض کہ انگلستان حق ضرب نہ لینے سے زر نقد کی افراط کے برے نتائج سے بچ جاتا ہے۔ دوسری صورت میں حق ضرب چونکہ مصارف سکّہ زنی سے زیادہ ہوتا ہے اس واسطے سرکار ٹکسال کے اجرا سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اکثر ممالک کے بادشاہوں نے اس طریق عمل سے بے انتہا فائدہ اٹھایا ہے مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس پر کوئی رائے زنی کریں ایک نہایت ضروری اقتصادی اصول کا ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ اشیاء کی قیمت

طلب ورسد کی مساوات سے متعین ہوتی ہے۔ لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ سونا اور چاندی جو اشیاء میں داخل ہیں اس کلیہ قانون کے دائرۂ عمل سے خارج ہوں۔ جب سونے چاندی کی مقدار ضرورت سے بڑھ جائے گی تو ان کی قدر ضرور کم ہو گی اور جب ان کی مقدار ضرورت سے کم ہو جائے گی، تو ظاہر ہے کہ ان کی قدر زیادہ ہو گی۔ سکے جو سونے اور چاندی سے بنائے جاتے ہیں ان کا بھی یہی حال ہے کہ افراط کی صورت میں ان کی قدر کم ہوتی ہے اور کمی کی صورت میں ان کی قدر بڑھتی ہے۔ فرض کرو کہ کسی ملک میں زر نقد کی مقدار اس ملک کی تجارتی ضروریات سے بہت کم ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں زر نقد کی قدر بسبب کمی رسد کے بڑھ جائے گی یا بالفاظ دیگر اشیاء کی قیمت کم ہو جائے گی اور تجارتی کاروبار نہ چل سکے گا۔ لیکن اگر کسی تدبیر سے زر نقد کی موجودہ مقدار نہایت تیزی اور سُرعت کے ساتھ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو سکے، تو تجارتی کاروبار بلا روک ٹوک چلتے جائیں گے۔ اشیاء کی قیمت اصلی حالت پر عود کر آئے گی اور مزید زر نقد کی ضرورت لاحق نہ ہو گی۔ پس ایسے ملک کے تجارتی مقاصد آسانی کے ساتھ پورے نہیں ہو سکتے، جب تک اس ملک میں زر نقد کی مقدار زیادہ نہ ہو۔ یا کوئی صورت اعتبار کی نہ استعمال کی جائے یا اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو کسی طرح مقدار موجود میں سرعت انتقال نہ پیدا ہو۔ کیونکہ سرعت انتقال بھی ایک طرح کی ازدیادی زر نقد ہے۔ جو سکّہ پہلے ایک دفعہ استعمال ہوتا تھا ممکن ہے کہ سرعت انتقال کی صورت میں دس دفعہ استعمال ہو یا یوں کہو کہ اس طریق سے ایک سکّہ وہی کام کر سکتا ہے جو ازدیادی زر نقد کی صورت میں دس سکّوں کی وساطت سے پورا ہوتا۔

گویا زر نقد کی سرعت انتقال کا زیادہ ہونا ایک طرح سے زر نقد کی مقدار کا زیادہ ہونا یا بالفاظ دیگر زر نقد کی قدر کا کم ہونا ہے اور اشیاء کی قیمت کا بڑھنا ہے علیٰ ہذا القیاس زر نقد کی قدر کی زیادتی اس کی مقدار اور سرعت انتقال اور قیمت اشیاء کی کمی پر دلالت کرتی ہے۔ لہٰذا جب کسی ملک میں زر نقد کی مقدار تجارتی ضروریات سے کم ہو تو اس کا علاج یہی ہو سکتا ہے کہ مقدار کو زیادہ کیا جاوے یا کسی تدبیر سے زر نقد کی سرعت انتقال زیادہ ہو جائے۔ لیکن جب کسی ملک میں زر نقد کی مقدار تجارتی ضروریات سے بہت بڑھ جائے یا یوں کہو کہ اشیاء کی

قیمتیں بڑھ جائیں، تو اس کا کیا علاج؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ زر نقد کی رسد کو محدود کر دیا جائے۔ ۱۸۹۴ء سے پہلے ہمارے ملک میں نئی کانوں کے دریافت ہونے اور ٹکسال کے عام طور پر کھلا ہونے سے روپے کی قدر بہت کم ہو کر ۱۳ پنس کے برابر رہ گئی تھی، جس سے ملک میں اشیاء کی قیمتیں بڑھ گئیں اور سرکار کی مالگذاری کو نقصان ہونے لگا۔ کیوں کہ جو روپیہ ہمیں انگلستان کی پنشنوں، تنخواہوں اور دیگر مصارفِ حکومت کی بابت دینا پڑتا ہے وہ مالگذاری میں سے ہی ادا کیا جاتا ہے۔ ایک پونڈ کے لیے جہاں پہلے دس روپے دینے پڑتے تھے چاندی کی قدر کم ہو جانے کی وجہ سے سولہ روپے دینے پڑے۔ کیونکہ ہم کو یہ روپیہ سونے کے سکّے میں ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کا علاج سرکار ہند نے یہ کیا کہ زر نقد کی رسد محدود کر دی یعنی ٹکسالیں بند کر دیں۔ آج کل رعایا کو یہ حق حاصل نہیں کہ چاندی کے ٹکڑے دے کر سرکاری ٹکسال سے روپیہ بنوالے، بلکہ سرکار ملک کی تجارتی ضرورتوں کو مد نظر رکھ کر خود روپیہ بناتی ہے۔ اس تجویز کی اگرچہ اس وقت مخالفت کی گئی تھی، لیکن اس کی عمدگی اس کے اثر سے ظاہر ہے۔ یعنی ہمارا روپیہ اب ۱۳ پنس کی جگہ ۱۶ پنس کے برابر ہو گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شے معیار قدر مقرر کی جائے اس کی قدر کا متغیر ہو جانا تمام تجارتی انتظام کو درہم برہم کر دیتا ہے۔

غرض کہ مندرجہ بالا توضیح سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ زر نقد کی قدر اس کی رسد کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ رسد زیادہ ہو گی تو اس کی قدر کم ہو گی۔ اور اگر رسد کم ہو گی، تو اس کی قدر بڑھے گی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اگر سرکار مصارف سکہ زنی سے زیادہ حق ضرب وصول کرے تو زر نقد کی قوت خرید یعنی قدر پر اس کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کسی ملک کی سرکار خواہ کتنا ہی حق ضرب کیوں نہ لے زر نقد کی قوت خرید وہی رہے گی۔ کیوں کہ یہ تو صرف تبادلہ کا ایک ذریعہ ہے۔ جب تک اس کی مقدار کسی ملک کی تجارتی ضرورتوں کے مطابق ہو گی، کوئی وجہ نہیں کہ اس کی قدر میں کوئی تغیّر آئے۔ لہٰذا نتیجہ ظاہر ہے کہ زر نقد کی قدر کی کمی بیشی اس کی رسد کی کمی بیشی پر موقوف ہے۔ حق ضرب کی کمی بیشی کو زر نقد کی قدر کی کمی بیشی کے ساتھ کوئی ضروری تعلق نہیں۔ اگر روپے میں ۱۱ آنے کی جگہ ۸ آنے کی چاندی

ڈالی جائے یا یوں کہو کہ سرکار ہند ۵ آنے کی جگہ ۸ آنے حق ضرب لیوے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے روپے کی قدر میں کمی پیدا ہو۔ روپیہ بحیثیت ایک وسیلہ تبادلہ ہونے کے بدستور سولہ آنے پر چلتا رہے گا۔

پس اس باب کی ساری بحث کو مختصر الفاظ میں یوں بیان کرسکتے ہیں کہ زر نقد کی قدر کی کمی کے دو ضروری اسباب ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔

اوّل- زر نامسکوک کی قیمت متعارف کا اس کی قیمت ضربی سے زیادہ ہونا جیسا کہ ابتداء میں لکھا جا چکا ہے۔

دوم- اس کی رسد کا تجارتی ضرورتوں سے زیادہ ہونا۔

تم کہو گے کہ اگر حق ضرب کا زیادہ ہونا اس کی قدر پر کچھ اثر نہیں رکھتا، تو پھر ایسے سکّوں کے جاری کرنے میں کیا حرج ہے جن کی قدر ان کی قدر حقیقی سے زیادہ ہو۔ بے شک سرکار خواہ کتنا ہی حق ضرب کیوں نہ لے کوئی نقصان نہیں۔ صرف یہ بات ہے کہ اگر ایسا سکّہ کثرت سے جاری کیا جائے تو تجارت بیرونی پر برا اثر ہوتا ہے کیونکہ دیگر ممالک میں ایسے سکّوں کی قدر زر نامسکوک اس مقدار کے لحاظ سے متعین ہوگی، جو ان میں شامل ہے۔

باب پنجم

زرِ کاغذی

باب گذشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ سرکار جس قدر چاہے حق ضرب لے سکتی ہے۔ ہندوستان میں ہماری سرکار فی الحال فی روپیہ پانچ آنے حق ضرب لیتی ہے۔ لیکن اقتصادی اصول کی رو سے اگر پندرہ آنے فی روپیہ بھی حق ضرب لیا جائے تو ملک کی خرید و فروخت کو کچھ نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ روپیہ فی الحقیقت تبادلۂ اشیاء کا ایک ذریعہ ہے۔ جس کی قدر دیگر اشیاء کی طرح رسد اور طلب کی درمیانی مساوات سے متعین ہوتی ہے۔ مختلف ممالک میں حق ضرب کی مقدار مختلف ہوتی ہے۔ بعض جگہ پانچ فی صدی بعض جگہ دس فی صدی۔ لیکن کیا سکّے کی کوئی ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے جس میں سرکار کے حق ضرب کی مقدار پورے سو فی صدی ہو؟ بے شک زر کاغذی کے اجرا کی صورت میں سکوّں کی وہ تمام مقدار بچ جاتی ہے جو زر مذکور کے عدم اجرا کی صورت میں سرکار کو جاری کرنی پڑتی۔ اگر سرکاری اوراق جو ہمارے ملک میں متداول ہیں جاری نہ کیے جاتے تو ظاہر ہے کہ سرکار کو ان کی جگہ سکہّ مذکور متداول کرنا پڑتا۔ لیکن اس زر کاغذی کی وساطت سے ہماری سرکار اس اجرا سے سبکدوش ہو گئی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ سکے کی اس خاص صورت میں ہماری سرکار نے پورے سو فی صدی حق ضرب لیا ہے۔ زر کاغذی کے پہلے موجد چین کے لوگ ہیں۔ بارھویں صدی میں جب کہ مشہور سیاّح مارکوپولو نے ملک چین کا سفر کیا تو اس سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک درخت کی چھال کا سکہ جاری ہے جو لین دین میں سونے چاندی کے سکوّں کی طرح استعمال ہوتا ہے۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں فارس اور جاپان کے حکمرانوں نے بھی چین کی تقلید کی لیکن یورپ کی اقوام نے اس کے استعمال کے فوائد صدیوں بعد محسوس کیے۔ زر کاغذی کی دو صورتیں ہیں۔

۱- زر کاغذی غیر متبدل جو عند المطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرایا جاسکتا۔

۲- زر کاغذی متبدل یا زر بنک جو عند الطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل کرایا جاسکتا ہے۔ مقدم الذکر کی صورت میں یا تو خود اسے سرکار جاری کرتی ہے یا بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کسی تجارتی یا دیگر حادثے کے باعث کسی ملک میں زر نقد کی مقدار کم ہوگئی تو سرکار حکماً زر بنک کو زر غیر متبدل کی صورت میں منتقل کر دیتی ہے۔ ایسی حالت میں زر بنک کو عند الطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کراسکتے۔ کیونکہ سرکار کے خزانے میں زر نقد ہوتا ہی نہیں، جو اس کے عوض میں دیا جائے۔ ۱۷۹۷ءاور ۱۸۲۱ء کے درمیان انگلستان میں اور ۱۸۴۸ء میں فرانس میں یہی حالت رہی کہ سرکاری بنکوں کے اوراق عند الطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل نہیں کرائے جاسکتے تھے۔ چونکہ زر کاغذی غیر متبدل میں اپنے آپ کو ملک کی حالت اقتصادی کے تغیرّ کے ساتھ مطابق کرنے کی قابلیت نہیں ہے، اس واسطے اس کا اجرا کچھ بہت مفید نہیں ہے۔

بعض حکماء کے نزدیک زر کاغذی زر نہیں کہلا سکتا کیونکہ ان کی رائے میں زر نقد کی یہ خاص صورت بحیثیت وسیلہ تبادلہ کے قومی اور تجارتی بہبودی کے لیے مضرت رساں ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ دلیل منطقی لحاظ سے بالکل ناقص ہے۔ اسی طرح کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ میں شراب کے استعمال کو بحیثیت اس کے کہ یہ پینے کی چیز ہے برا سمجھتا ہوں لہذا شراب پینے کی چیز نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شے زر نقد کے مقاصد کو انجام دیتی ہے وہ زر نقد ہے، خواہ کاغذ ہو خواہ پتھر۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ زر کاغذی زر نقد کی طرح وسیلہ تبادلہ کی حیثیت سے استعمال ہو سکتا ہے۔ اور حقیقتاً اس حیثیت سے مختلف ممالک میں استعمال ہوا ہے اور ہوتا ہے۔ جوں جوں کسی ملک میں پیدائش دولت اور تجارت کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں توں توں ضرورت مجبور کرتی ہے کہ زر نقد کے مقاصد کو سرانجام دینے کی نئی نئی صورتیں پیدا ہوں۔ ایسے حالات میں جو شے خواہ وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو ان مقاصد کو پورا کرے گی، زر نقد یا زر نقد کی قائم مقام ہوگی۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ زر کاغذی ہمیشہ اور ہر ملک میں زر نقد ہے۔ بلکہ ہمارا مدعا یہ ہے کہ جب کسی جگہ سکے کی یہ صورت زر نقد کے مقاصد کو

پورا کرنا شروع کرتی ہے، اس وقت سے زر نقد بن جاتی ہے اور جب تک ان مقاصد کو پورا کرتی رہتی ہے زر نقد ہی بنی رہتی ہے اور اگر کسی ملک کی سرکار دیوالیہ ہو جائے اور اپنے جاری کردہ اوراق کو قانوناً زر کاغذی غیر متبدل کی صورت میں منتقل نہ کرے، تو ظاہر ہے کہ سرکاری اوراق کو خرید و فروخت میں کوئی شخص قبول نہ کرے گا یا یوں کہو کہ سرکاری اوراق زر نقد نہ رہیں گے۔ اسی بنا پر زر کاغذی بطور معیار قدر بھی مستعمل ہو سکتا ہے کیونکہ جو شے وسیلہ تبادلہ ہو گی ضرور ہے کہ معیار قدر بھی ہو۔ علی ہذا القیاس زر کاغذی ادائیگی غیر معجل کا معیار بھی ہو سکتا ہے کیونکہ بالعموم یہ نقد قانونی ہوتا ہے یعنی قرض خواہ قانوناً اس کے قبول کرنے پر مجبور کیے جاسکتے ہیں بلکہ اگر یہ نقد قانونی نہ بھی ہو تو بھی یہ روز مرّہ کے استعمال میں غالباً ادائیگی غیر معجل کا معیار قرار پاجائیں گے۔ کیونکہ ہر شخص اشیاء کی قیمتوں کو زر نقد متداول سے تعبیر کرنے کا ایک زبردست میلان رکھتا ہے۔ لہذا زر نقد کی طرح زر کاغذی کی قدر بھی اس کی طلب و رسد پر انحصار رکھتی ہے اور جس طرح ہم پہلے ثابت کر آئے ہیں کہ حق ضرب اور زر نقد کی قدر کی کمی بیشی کے درمیان کوئی ضروری تعلق نہیں ہے اسی طرح سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ زر کاغذی کے غیر متبدل ہونے اور اس کی کمی بیشی کے درمیان کوئی ضروری رشتہ نہیں۔ اس کی قدر صرف ایسی صورت میں کم ہو سکتی ہے جب اس کی مقدار ان سکوّں کی قیمت ضربی سے زیادہ ہو، جو اس کی عدم اجرا کی صورت میں متداول کرنی پڑی۔ اس کی ارزانی اس کے اجرا کی محرّک ہوتی ہے۔ اور اس کے اجرا کی ضرورت اس وقت پڑتی ہے جب کہ سرکار کو فائدہ اٹھانا مطلب ہو یا کسی قومی حادثے کے باعث زر نقد کی مقدار کم ہو گئی ہو۔ غرض کہ زر کاغذی زر نقد کے تمام مقاصد کو پورا کر سکتا ہے۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ یہ زر نقد نہ ہو سکے۔ بشرطیکہ اس کی مقدار متداول زائد از ضروریات ملکی نہ ہو۔ اگر اس کی مقدار زائد از ضرورت ہو گی تو اس کی قدر کم ہو جائے گی اور قرض خواہوں کو نقصان ہو گا۔ مقروض فائدے میں رہیں گے کیونکہ اس کی قوت خرید بسبب کمی قدر دن بدن کم ہوتی جائے گی اور چونکہ یہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل نہیں ہو سکے گا (کیونکہ دیگر ممالک کے لوگ کم قدر کے سکّے کو قبول نہیں کریں گے بلکہ پوری قدر قائم رہنے کی صورت

میں بھی اس کا قبول کرنا نہ کرنا ان کے اختیار میں ہے) اس واسطے اس ملک کی تجارت خارجی کو انتہا درجے کا نقصان پہنچے گا۔ جہاں زر کاغذی کی قدر کم ہو گئی ہے۔

زر بنک[1] اس زر کاغذی کا نام ہے جو عند الطلب زر نقد کی صورت میں تبدیل کرایا جاسکتا ہو۔ سرکار یا خود اپنی بنک جاری کرتی ہے یہ چند اشخاص جمع ہو کر سرکار کی منظوری سے بطور خود بنک جاری کر سکتے ہیں۔ لیکن دونوں صورتوں میں بنک کا چلنا بنک والوں کے اعتبار یا ساکھ پر منحصر ہے۔ اگر ان کی ساکھ نہ ہو گی تو نہ کوئی شخص ان کے جاری کردہ اوراق کو قبول کرے گا اور نہ ان کی تفویض میں اپنا روپیہ دے گا۔ چونکہ زر کاغذی کے تداول کی بنا ساکھ پر ہے، اس واسطے ظاہر ہے کہ ہر بنک کے پاس زر نقد کی ایک کافی مقدار موجود ہونی چاہیے تاکہ جس وقت کوئی شخص کسی بنک کے اوراق کو بنک مذکور سے زر نقد کی صورت میں تبدیل کرانا چاہے فورا کرا سکے۔ اگر ایسا نہ ہو گا تو بنک کی ساکھ جاتی رہے گی۔ لہذا ہر بنک اس خوف کو مد نظر رکھ کر زر مسکوک کی ایک خاص مقدار اپنے پاس رکھتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ جس قدر زر نقد کسی بنک کے پاس موجود ہے اس سے بہت زیادہ کے اوراق جاری کیے جائیں ورنہ بنک کو کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات ساکھ یا اعتبار کے بل پر ہی ہو سکتی ہے بصورت دیگر ممکن نہیں۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بنک والے کم شرح سود کے عوض ایک سے روپیہ مستعار لیتے ہیں اور دوسرے کو زیادہ شرح سود کے عوض مستعار دے کر فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بنک کبھی روپیہ قرض نہیں دیتا۔ بلکہ ساکھ کے بل پر اپنی موجودہ زر نقد کی مقدار سے زیادہ کے اوراق جاری کر کے یا اعتبار کی اور صورتیں پیدا کر کے فائدہ اٹھاتا ہے۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ بنک ایک قسم کی دکان ہے جہاں اعتبار بکتا ہے۔ لوگ اپنا روپیہ، تجارتی ہنڈیاں اور حقوق کی دیگر صورتیں لاتے ہیں اور بنک ان کے عوض میں گویا اپنے اعتبار کی ایک مساوی مقدار دیتا ہے یا یوں کہو کہ وہ اپنے گاہکوں کو یہ حق دیتا ہے کہ جب چاہیں، جہاں چاہیں اپنا روپیہ وصول کر لیں۔ یا یہ حق وصولی کسی اور کو تفویض کر دیویں اور بصورت عدم ادائیگی اس پر نالش کر کے وصول کر لیں۔

---

[1] لفظ بنک عام طور پر حال کی عربی زبان میں مستعمل ہوتا ہے اس کی جمع بنوک آتی ہے لہذا ترکیب اضافی میں اس کا استعمال خلاف قواعد اردو نہیں ہے۔

چونکہ وہ حقوق جو بنک اپنے گاہکوں کو دیتا ہے غیر مادّی ہونے کی وجہ سے قابلیت انتقال نہیں رکھتے۔ اس واسطے ضرور ہے کہ اس غرض کے لیے ان کو کاغذ پر تحریر کیا جائے۔ لہذا بنک یا تو اپنے اوراق جاری کرتا ہے جس کے یہ معنے ہیں کہ گاہک کو یا ورقۂ بنک کے قابض کو کوئی خاص رقم عند الطلب ادا کر دی جائے گی یا گاہک بنک کو اپنا دستی رقعہ لکھ سکتا ہے کہ کوئی خاص رقم عند الطلب فلاں شخص کو ادا کر دی جائے۔ اس قسم کے رقعہ کو چک کہتے ہیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ جو روپیہ بنک اپنے اعتبار کے عوض میں اوروں سے وصول کرتا ہے وہ امانت نہیں ہے بلکہ بنک کی ملکیت ہے، جس کو بنک تجارتی اغراض میں لگا کر فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس روپیے کے بل پر وہ اعتبار کے عوض دیگر حقوق خرید کرتا ہے اور اس کے اعتبار کی مقدار جس کے عوض میں وہ دیگر حقوق خرید کرتا ہے روپے کی اس مقدار سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جو اس کے پاس موجود ہوتی ہے۔ اعتبار کی اس قدر توسیع ہی اس کے فائدہ کی بنیاد ہے۔ لہذا جو شخص یہ کہتا ہے کہ میرا اس قدر روپیہ بنک میں موجود ہے، وہ اگرچہ محاورۂ متعارف کے رو سے صحیح الفاظ استعمال کرتا ہے تاہم اصول بنک کے لحاظ سے یہ استعمال صحیح نہیں ہے، کیونکہ بنک میں جس قدر روپیہ ہے وہ بنک کی ملکیت ہے، نہ ان اشخاص کی جن سے وہ روپیہ لیا گیا ہے۔ البتہ یہ اشخاص ایک مجرّد حق کے مالک ہیں یعنی ان کو یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہیں، جہاں چاہیں اپنا روپیہ وصول کر لیویں۔ پس ظاہر ہے کہ بنک کا سرمایہ اس کا اعتبار ہے۔ وہ اس اعتبار کی وساطت سے روپیہ تجارتی قرضے، حقوق نالش اور دیگر اقسام کے مجرد حقوق بعینہ اسی طرح خرید کرتا ہے جس طرح کوئی شے روپے کی وساطت سے خریدی جاوے اور اپنے اعتبار کی قیمت بھی اسی طرح وصول کرتا ہے جیسے یہ حقیقت میں زر نقد ہے۔ جس طرح سوداگر اپنی اشیاء کو کم قیمت پر خرید کرتا ہے اور زیادہ قیمت پر بیچ کر فائدہ اٹھاتا ہے۔ اسی طرح بنک بھی اپنی اشیاء یعنی اعتباراتِ فرضی اور حقوق نالشی وغیرہ کو ایک شخص یعنی اپنے گاہک سے خرید کرتا ہے اور ان کو زیادہ قیمت پر اور شخص یعنی مقروض کے پاس فروخت کرتا ہے۔ کیونکہ جس قرض کو بنک خرید کرتا ہے اس کی قیمت دن بدن بڑھ رہی ہے اور بڑھتی رہے گی جب تک کہ وہ ادا نہ ہو جائے چونکہ اس خرید و فروخت سے جس کی بنا اس کے ذاتی

اعتبار پر ہے بنک کو منافع ہوتا ہے لہذا بنک کا ذاتی اعتبار اس کا سرمایہ ہے جو بنک کی موجودہ زر نقد کی مقدار سے زیادہ ہونے کے باعث ملک کے سرمایے کو بہت زیادہ کر دیتا ہے۔

بعض محققین کی یہ رائے ہے کہ اگر زربنک کو زرنقد کی صورت میں تبدیل کرانے میں ہر طرح کی آسانی ہو تو ہر حالت میں ایسا ہی ہوگا جیسا سونے چاندی کے سکے جن کو یہ تعبیر کرتا ہے۔ گویا زر نقد کی ان دونوں صورتوں کے درمیان کوئی فرق نہ ہوگا۔ مگر اس غرض کے لیے کہ زربنک ہر حالت میں ایسا ہی رہے جیسا کہ سونے چاندی کے سکّے جن کو یہ تعبیر کرتا ہے، ضروری ہے کہ بنکوں کا انتظام نہایت صحیح اصول کے مطابق ہو۔ اس رائے کو علم اقتصاد کی اصطلاح میں اصول بنک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بعض حکماء اس رائے کے مخالف ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اگر ملک کے تمام بنکوں کو یہ اختیار ہو کہ اپنے اپنے سودوزیاں کو ملحوظ رکھ کر جس قدر چاہیں اوراق جاری کریں تو ضروریات ملکی سے زیادہ اوراق جاری ہو جانے کا اندیشہ ہوگا۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ بنکوں کے اجرائے اوراق پر قانونی قیود ہوں۔ یہ اصول جس کو علم الاقتصاد کی اصطلاح میں اصول تداول سے موسوم کرتے ہیں اوّل اوّل ملک چین میں وضع کیا گیا تھا۔ اسی اصول پر انگلستان میں ۱۸۴۴ء میں بنک ایکٹ پاس ہوا جس کے شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

۱- بنک انگلستان کو ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ سے زیادہ کے اوراق جاری کرنے کا اختیار نہ ہوگا۔ رقم مذکور سے زیادہ کے اوراق جاری کرنے کے لیے اس کے پاس زر مسکوک کی مقدار موجود ہونی چاہیے۔

۲- بنک مذکور کا محکمہ اجرائے اوراق اور محکمۂ بنک الگ الگ ہوں گے۔

۳- لندن کا کوئی اور بنک یا کوئی ایسا بنک جس کی میعاد ۱۸۴۴ء سے شروع ہوتی ہے اوراق نہیں جاری کر سکے گا۔ ۱۸۴۴ء سے پہلے کے بنک اپنی اوراق کی تعداد اس تعداد سے زیادہ نہیں کر سکیں گے جو سن مذکور میں تھی۔

مذکورہ بالا ہر دو راؤں کے مؤیدوں کے درمیان ایک طول طویل بحث بڑی سرگرمی کے ساتھ جاری ہے اور چونکہ جانبین کے دلائل ہماری رائے میں ہم وزن معلوم ہوتے ہیں اس واسطے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ دونوں میں کون سی رائے قابل ترجیح ہے۔

باب ششم

اعتبار کی ماہیت و مقاصد
اور اس کا اثر اشیاء کی قیمتوں پر

جب کوئی شخص یہ حق رکھتا ہے کہ کسی دوسرے شخص سے عند الطلب یا ایک مقررہ میعاد کے بعد کوئی رقم وصول کرے یا اس سے کوئی خدمت لیوے تو اس حق کو حق اعتبار کہتے ہیں۔ مثلاً فرض کرو کہ میں کسی سوداگر سے کوئی شے اس معاہدے پر خرید تا ہوں کہ کسی خاص میعاد کے بعد اس شے کے عوض میں اس قدر رقم ادا کر دوں گا۔ ظاہر ہے کہ گویا یہ چیز میں نے اپنے اعتبار کی وساطت سے خرید کی ہے اور اس کے عوض سوداگر مذکور کو یہ حق دیا ہے کہ اگر میں مقررہ میعاد کے بعد رقم مذکور ادا نہ کروں تو اسے اختیار ہے کہ قانونی چارہ جوئی کر کے وہ رقم وصول کر لے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر میں کسی ڈاکخانے سے کوئی ٹکٹ والا لفافہ خرید کروں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ مجھے ڈاکخانے پر اعتبار ہے کہ میرا خط فلاں مقام پر پہنچ جائے گا۔ اگر مجھے یہ اعتبار نہ ہوتا تو میں اس لفافے کو ہرگز نہ خرید کرتا۔ گویا میں نے اپنے پیسوں کے عوض ڈاکخانہ کا اعتبار خرید کیا ہے اور ڈاکخانے نے اپنے اعتبار کے عوض میرے پیسے خرید کیے ہیں۔

ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ زمانۂ حال کے مہذّب ممالک میں اعتبار اور دیگر حقوق بھی بطور سرمایہ مستعمل ہو کر ملک کے سرمایے کو بہت زیادہ کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بڑے بڑے رفاہ عام کے کام مثلاً ریلوے اور آب رسانی وغیرہ انجام پذیر نہ ہوسکتے کیونکہ ایسے کاموں کے لیے کثیر سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے، جو بالعموم فرد واحد مہیا نہیں کر سکتا۔ بلکہ چند آدمی مل کر اپنے اعتبار پر اوروں سے روپیہ حاصل کرتے ہیں اور اس مجموعی کوشش سے بڑے بڑے عظیم الشان اور منفعت خیز کام کر کے مزید دولت پیدا کرتے ہیں۔

بعض حکماء اس بات پر مصر ہیں کہ کسی شخص کا ذاتی اعتبار اس شخص کی دولت میں داخل نہیں، لیکن یہ رائے صریحاً غلط ہے۔ ہر شے جو قوت خرید رکھتی ہے، دولت ہے۔ اور چونکہ اعتبار کی وساطت سے بھی اشیاء اسی طرح خریدی جاسکتی ہیں جس طرح نقد روپے کی وساطت سے یعنی اعتبار بھی قوت خرید رکھتا ہے۔ اس واسطے صریح نتیجہ یہ ہے کہ اعتبار دولت ہے۔ یہ ایک ایسا قیاس ہے جس سے کسی کو گریز نہیں ہو سکتا۔

اعتبار کی غرض وغایت یا مقصد تجارت کے دائرہ کو وسیع کرنا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ میں ایک کتاب کا حق تصنیف خرید کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ جو روپیہ میں نے حق مذکور کے عوض میں دیا ہے وہ اس توقع پر دیا ہے کہ مجھے اس حق کے قبضے سے آئندہ منافع ہو گا۔ اگر یہ توقع نہ ہوتی تو میں یہ حق ہرگز نہ خرید کرتا۔ بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جو روپیہ میں نے دیا ہے وہ اس منافع کی قیمت نقد ہے جو مجھے اس حق کے قبضے سے آئندہ حاصل کرنے کی توقع ہے۔ پس اس توقع یا اعتبار کی بدولت اس منافع کی قیمت نقد بھی تجارت یا خرید وفروخت کے دائرہ میں آگئی جو ابھی حاصل ہونا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جب میں کسی کمپنی کے حصص خریدتا ہوں تو میری غرض یہی ہوتی ہے کہ مجھے منافع ہو، اگر مجھے کمپنی مذکور کے حصص کی خرید سے آئندہ منافع کی توقع نہ ہو یا کہو کہ کمپنی مذکور پر اعتبار نہ ہو تو میں کبھی ان حصص کا خریدار نہ ہوں گا۔ پس کمپنی کے اعتبار کی وساطت سے حصص کے آئندہ منافع کی قیمت نقد (یعنی جو روپیہ میں نے حصص کے عوض اب ادا کر دیا ہے) بھی تجارت کے دائرہ میں آگئی۔ لہذا اعتبار کا مقصد منافع مستقبلہ کی قیمت نقد کو تجارت کے دائرہ میں لانا ہے۔ کسی فرانسیسی مصنّف نے کیا خوب کہا ہے:

"کہ انسان مکان کو تجارت کے ذریعہ اور زمان کو اعتبار کے ذریعہ فتح کرتا ہے۔"

چونکہ اعتبار اور اس کی مختلف صورتیں یعنی تجارتی ہنڈیاں، چک اور اوراق بنک وغیرہ زر نقد کے قائم مقام ہیں، اس واسطے تھوک فروشی کی صورت میں ان کا استعمال بالخصوص مفید ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی ہنڈی کئی سوداگروں کے ہاتھوں میں پھر جاتی ہے اور ان کی تجارتی ضروریات کو اس طرح رفع کرتی ہے جس طرح زر نقد۔ مثلاً فرض کرو کہ ب نے اسے ہزار روپے کی ہنڈی لی ہے۔ ب اس ہنڈی کی پشت پر دستخط کر کے ج سے

ہزار روپے کی اشیاء خرید کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح ج اس کی پشت پر دستخط کر کے د سے اشیاء خرید کر سکتا ہے۔ اور یہ عمل متواتر کئی بار ہو سکتا ہے۔ اس مثال سے واضح ہوتا ہے کہ ہنڈی مذکور میں زر نقد کی سی قوت خرید ہے اور اس کا اثر خرید و فروخت پر ایسا ہی ہوتا ہے جیسا کہ زر نقد کا۔ پس جب تک یہ ہنڈی متداول رہے گی ہزار روپے کے قائم مقام تصوّر کی جائے گی۔ کیونکہ اگر ہنڈیاں اور اعتبار کی دیگر صورتیں استعمال میں نہ آتیں تو صاف ظاہر ہے کہ خرید و فروخت میں زر نقد کی ضرورت پڑتی۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ اشیاء کی قیمتیں زر نقد متداول کی مقدار پر منحصر ہیں۔ اگر اشیاء تجارت کی تعداد وہی رہے اور زر نقد کی مقدار بڑھ جاوے تو ظاہر ہے کہ اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ علی ہذا القیاس اگر اشیاء تجارت کی تعداد بڑھ جاوے اور زر نقد متداول کی تعداد بدستور وہی رہے۔ اس میں تحریک سرعتِ انتقال پیدا نہ ہو تو اشیاء کی قیمتیں کم ہو جائیں گی۔ کیوں کہ زر نقد کی مقدار کی کمی کے باعث اس کی قدر زیادہ ہو جائے گی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ اس کے عوض بہت سی اشیاء مل سکیں گی۔ جوں جوں کسی ملک میں اشیاء تجارت کی تعداد بڑھتی جاتی ہے یا یوں کہو کہ خرید و فروخت کے نئے نئے موقعے نکلتے آتے ہیں توں توں زر نقد متداول کی مقدار بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوتی جاتی ہے۔ جن ممالک میں انسانی جان و مال ہر طرح سے محفوظ ہیں وہاں اس ضرورت کو پورا کرنے کی خاطر اعتبار کی مختلف صورتیں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ کیوں کہ ان سے بھی وہی کام نکلتا ہے جو زر نقد کے استعمال سے۔ اگر تجارتی ہنڈیاں یا اعتبار کی دیگر صورتیں دائرہ تجارت میں نہ آتیں تو زر نقد متداول کی مقدار کو بڑھانے کی ضرورت پڑتی، ورنہ اشیاء کی قیمتیں بسبب زر نقد کی قدر کے زیادہ ہو جانے کے کم ہو جاتیں۔ پس ظاہر ہے کہ وہ خرید و فروخت جو اب ہنڈیوں یا دیگر اعتبار کی صورتوں کی وساطت سے ہوتی ہے، زر نقد کی وساطت سے ہوتی، تو دو نتیجوں میں سے ایک نتیجہ ضرور پیدا ہوتا یا زر نقد کی زیادہ مقدار متداول کرنی پڑتی یا اشیاء کی قیمتیں کم ہو جاتیں۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہنڈیوں کا اثر جو اشیاء کی قیمتوں پر پڑتا ہے، اس کا باعث یہ نہیں کہ ہنڈی میں کوئی خاص قسم کی خصوصیت ہے۔ ہنڈی یا اعتبار کی اور صورت بذات خود کوئی اثر اشیاء کی قیمتوں پر نہیں ڈال

سکتی۔ بلکہ یہ اثر اس اعتبار کا نتیجہ ہے جس کا کہ ہنڈی مذکور محض ایک تحریری ثبوت یا شہادت ہے۔ سوداگروں کی بہیوں میں جو خریداروں کا حساب درج ہوتا ہے۔ وہ بھی اشیاء کی قیمتوں پر ویسا ہی اثر ڈال سکتا ہے۔ کیونکہ یہ بھی اعتبار ہی کی ایک شکل ہے۔ ہاں اس قدر فرق ضرور ہے کہ ہنڈی کی طرح بہی کا حساب دست بدست منتقل نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے اس میں یہ قابلیت نہیں ہے کہ اس کی وساطت سے تجارتی اشیاء خرید کی جا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشیاء کی قیمتوں پر حساب مذکور کا اثر محدود ہوتا ہے۔

اعتبار کا ایک اور اثر یہ ہے کہ اس کا استعمال کسی خاص فرد یا ملک کی قوت خرید کو بہت زیادہ کر دیتا ہے۔ اگر خرید و فروخت میں اعتبار سے کام نہ لیا جاتا تو اشیاء کی طلب موجودہ صورت سے بہت کم ہوتی۔ یہ سب اسی کا ظہور ہے کہ بعض دفعہ کسی شے کی مانگ غیر محدود طور پر بڑھ جاتی ہے۔ ۱۸۲۹ء میں جب ہماری سرکار کا ملک چین سے تنازعہ ہوا تو اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ چائے کی رسد کم ہو جائے گی اور اس واسطے اس کی قیمت بہت بڑھ جائے گی۔ لہٰذا اکثر دکاندار اس اثر کے خواہشمند تھے کہ شے مذکورہ کا ذخیرہ جمع کر لیں اور ضرورت کے موقع پر فائدہ اٹھائیں۔ ایک دکاندار کے پاس صرف ۱۲۰۰ پونڈ کا سرمایہ تھا جو اس کے تجارتی کاروبار میں لگا ہوا تھا لیکن اس نے یہ تدبیر کی کہ جن سوداگروں کے ساتھ اس کی مدّت سے ساکھ چلی آتی تھی ان سے اپنے نام کی سہ ماہی ہنڈیاں دے کر چائے کی ایک کثیر مقدار خرید کر لی۔ ہنڈیوں کی میعاد ختم ہونے سے پیشتر ہی چائے کی قیمت بہت بڑھ گئی اور دکاندار مذکور نے بے انتہا فائدہ اٹھایا۔ اگر اعتبار نہ ہوتا تو دکاندار مذکور میں یہ قوت خرید نہ ہوتی جو اس کے لیے اس قدر سود مند ثابت ہوئی۔

حصہ چہارم

پیداوارِ دولت کے حصہ دار

باب اول

لگان

تمدّن انسانی کی ابتدائی صورتوں میں حق ملکیت یا جائیداد شخصی کا وجود مطلق نہ تھا۔ محنت کی پیداوار میں حسب ضرورت ہر شخص کا حصّہ تھا۔ ہر شے ہر شخص کی گویا ملکیت تھی اور کوئی خاص فرد یہ دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ یہ خاص شے میری ملکیت ہے اور یہ کسی اور کی۔ نہ کہیں افلاس کی شکایت تھی نہ چوری کا کھٹکا تھا۔ قبائل انسانی مل کر گزران کرتے تھے اور امن و صلح کاری کے ساتھ اپنے دن کاٹتے تھے۔ یہ مشارکت جو اس ابتدائی تمدن میں انسان کا اصول معاشرت تھی ہمارے ملک کے اکثر دیہات میں اس وقت بھی کسی نہ کسی صورت میں مروج ہے۔ زمانۂ حال کے بعض فلسفی اس بات پر مصر ہیں کہ تمدّن کی یہی صورت سب سے اعلیٰ اور افضل ہے۔ نظام قدرت میں نوع انسانی کے تمام افراد مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ کوئی کسی کا دبیل نہیں ہے اور تمام تمدّنی امتیازات مثلاً سرمایہ دار اور محنتی، آقا و ملازم وغیرہ بالکل بے معنی ہیں۔ جائیداد شخصی تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ لہذا اقوام دنیا کی بہبودی اسی میں ہے کہ ان بے جا امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے قدیمی اور قدرتی اصول مشارکت فی الاشیاء کو مروّج کیا جائے۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ملکیت زمین کی صورت میں ہی اس اصول پر عمل درآمد کیا جائے۔ کیونکہ یہ شے کسی خاص فرد یا قوم کی محنت کا نتیجہ نہیں ہے، بلکہ قدرت کا ایک مشترکہ عطیہ ہے جس میں قوم کے ہر فرد کو مساوی حق ملکیت حاصل ہے۔ حال کی علمی بحثوں میں یہ بحث بڑی دلچسپ اور نتیجہ خیز ہے۔ لیکن ہم اس کا مفصّل ذکر اس ابتدائی کتاب میں نہیں کرنا چاہتے۔ یہاں صرف اس قدر یاد رکھنا چاہیے کہ نظام تمدّن کی موجودہ صورت میں جائیداد شخصی ایک ضروری جزو ہے اور پیداوار محنت یعنی دولت کی تقسیم

اسی کی رو سے ہوتی ہے۔ کتاب کے اس حصّے میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ وہ کون کون سے اسباب ہیں جن کے عمل سے دولت اپنے پیدا کرنے والوں کے درمیان تقسیم ہوتی ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ تمام ممالک میں جہاں دستکاری ایک مرتب و منتظم صورت میں ہے دولت چار حصوّں میں تقسیم ہوتی ہے یعنی:

۱-زمین دار کا حصّہ یا لگان

۲-سرمایہ دار کا حصّہ یا سود

۳-مالک یا کارخانہ دار کا حصہ یا منافع

۴-محنتی کا حصّہ یا اجرت

مفتوح ممالک میں دولت کا ایک پانچواں حصّہ دار بھی ہوتا ہے، یعنی حکمران جس کے حصّے کو مالگذاری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ باب ہذا میں ہم صرف لگان کی نسبت کچھ کہنا چاہتے ہیں۔

لگان وہ معاوضہ نقد یا جنس ہے جو زمین کے استعمال کے عوض میں مالک زمین کو ادا کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ معاوضہ بالعموم نقدی یا جنس کی صورت میں ادا کیا جاتا ہے۔ تاہم خدمت کی صورت میں بھی ادا ہو سکتا ہے، جیسے ہندوستان کے بعض دیہات میں مالکان دہ امام مسجد کو ایک خاص قطعہ زمین کاشت کے لیے دے دیتے ہیں اور اس سے کوئی لگان نہیں وصول کرتے۔ گویا اس کی مذہبی خدمت ہی لگان تصور کی جاتی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ زمین جس کے استعمال کے عوض میں لگان ادا کیا جاتا ہے مزروعہ ہی ہو بلکہ لگان ایک وسیع لفظ ہے جس کا اطلاق کانوں، چراگاہوں اور حقوق آب پاشی وغیرہ کی صورت میں بھی ہوتا ہے۔

اس مقام پر تم قدرتاً یہ سوال کرو گے کہ لگان کی مقدار کس طرح متعین ہوتی ہے یا وہ کون سے اسباب ہیں جو اس کی مقدار کی تعیین میں اثر رکھتے ہیں؟ تم اس کتاب کے کسی گذشتہ باب میں پڑھ آئے ہو کہ قانون طلب و رسد ایک ایسا اقتصادی قانون ہے جس کے عمل سے ہر شے کی قیمت متعین ہوتی ہے۔ لگان کی مقدار بھی اسی وسیع قانون کے عمل سے آزاد نہیں ہے البتہ بعض ممالک میں اختلاف حالات کے سبب سے اس قانون کا عمل کامل طور پر نہیں

ہوسکتا۔ صوبہ جاتِ متحدہ امریکہ میں اور علیٰ ہذا القیاس کینیڈا اور آسٹریلیا میں چونکہ زمینداروں اور کاشتکاروں کے درمیان ایک بلاقید اور آزاد مقابلہ ہے، اس واسطے وہاں کے لگان اسی قانون کے عمل سے متعیّن ہوتے ہیں۔ انگلستان میں چونکہ کاشتکاروں کے ساتھ بسا اوقات ہمدردی کی جاتی ہے اس واسطے قانون مذکور پورے طور پر اپنا عمل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ زمیندار کاشتکاروں کو کئی طرح کی رعایات دے دینے کے باعث اقتصادی معنوں میں پوری مقدار لگان کی حاصل نہیں کرسکتے۔ آئرلینڈ میں زمینداروں اور کاشتکاروں کے قومی اور مذہبی اختلافات اور کاشتکاروں کی آبادی بڑھ جانے کے باعث مقابلہ کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ بے چارے کاشتکار اندازے سے زیادہ لگان ادا کرنے پر مجبور ہو جانے کے سبب سے ہمیشہ زمینداروں کے مقروض رہتے ہیں اور روزبروز مفلس ہوتے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں مزارعین کے کئی اقسام ہیں، یعنی تابع مرضی میعادی یا غیر میعادی اور مزارعین موروثی جن کو اس زمین پر جس کو وہ کاشت کرتے ہیں ایک خاص قسم کا حق ملکیت حاصل ہوتا ہے۔ مقدم الذکر مزارعین کی صورت میں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لگان کی تعیین قانون طلب ورسد کے عمل پر انحصار رکھتی ہے، مگر مؤخر الذکر قسم کے مزارعین کے لگان کی مقدار قانوناً مقرر ہے اور بعض خاص صورتوں کے سوائے اس مقررہ مقدار میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی۔ نظری لحاظ سے، ہمارے ہندوستان میں سرکار خود زمیندار ہے اور ہمیشہ اس امر میں ساعی رہتی ہے کہ مزارعین کی حقّیت اراضی ہر طرح سے محفوظ ہو۔

یاد رکھنا چاہیے کہ زمین کی قیمت اور اس کے لگان کے درمیان ایک ضروری تعلق ہے۔ زمین کی قیمت صرف اسی وجہ سے ہے کہ اس سے لگان ملتا ہے۔ اگر لگان نہ ہوتا تو قیمت بھی نہ ہوتی۔ لیکن اگرچہ یہ تعلق بڑا ضروری ہے بلکہ ایک طرح سے وہی تعلق ہے جو علّت و معلول کے درمیان ہوتا ہے۔ تاہم قیمت زمین اور لگان کی درمیانی نسبت مختلف ممالک میں مختلف ہوتی ہے۔ بعض ممالک میں جہاں سرمایے کی مقدار بہت ہے اور انسانی حقوق ہر طرح سے محفوظ ہیں اور زمین کی ملکیت سے ایک تمدّنی امتیاز حاصل ہوتا ہے، وہاں زمین کی قیمت اس کے سالانہ لگان سے بیس پچیس بلکہ تیس گنا بھی ہوتی ہے کیونکہ ان ممالک میں خریدار

زمین کو صرف لگان ہی کا خیال نہیں ہوتا بلکہ وہ اعزاز و امتیاز بھی اس کے مدّ نظر ہوتا ہے جو خرید زمین کا ضروری نتیجہ ہوا کرتا ہے۔

لگان کے متعلق ایک اور ضروری مسئلہ کا یاد رکھنا بھی لازم ہے اور وہ یہ ہے کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ اگر لگان معاف کر دیے جائیں تو زرعی پیداوار کی قیمت میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اس کتاب کے کسی گذشتہ باب میں ہم دو اقتصادی اصول بیان کر آئے ہیں:

۱- ایک ہی منڈی میں ایک ہی وقت پر ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک ہی ہوا کرتی ہے۔

۲- کسی شے کی معمولی قیمت اس شے کی رسد کے اس حصّے کے مصارفِ پیدائش سے متعین ہوتی ہے جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہو۔

ان ہر دو اصول کو ملحوظ خاطر رکھ کر مندرجہ بالا مسئلے کے سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمھیں معلوم ہے کہ انگلستان کو جس قدر غلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ سارے کا سارا انگلستان کی زمینوں میں ہی پیدا نہیں کیا جاتا، بلکہ بعید المقام ممالک سے لایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انگلستان کو اخراجات انتقال باربرداری کے علاوہ اس غلّے کے مصارفِ پیدائش بھی ادا کرنے پڑتے ہیں۔ پس ہر دو مندرجہ بالا اصول کے رو سے ضرور ہے کہ انگلستانی غلے کی قیمت اس غلّے کی قیمت کے برابر ہو جو دیگر مقامات سے لایا جاتا ہے۔ کیونکہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی شے کی دو مختلف قیمتیں نہیں ہوسکتیں۔ بشرطیکہ ان کے خواص میں کوئی نمایاں فرق نہ ہو۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جو شخص انگلستان میں ان غیر ممالک کی نسبت جو انگلستان کو غلہ مہیا کرتے ہیں، کم مصارف پر غلّہ پیدا کر سکتا ہے، وہ فائدے میں رہتا ہے۔ کیونکہ انگلستانی غلّے کی قیمت اس غلے کی قیمت کے مساوی ہوگی جو دیگر ممالک سے لایا جاتا ہے۔ یہ فائدہ یا تو مالک زمین کا حق ہے یا کاشتکار کا۔ محنتی اور خریدار غلّہ کو اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ فرضاً اگر کوئی مالک زمین نصف لگان معاف کر دے تو اس کے مزارع یا کاشتکار غلّے کو کم قیمت پر فروخت نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ غلّہ مذکور کو قیمت متعارف پر فروخت کرسکتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی کوئی ضروری نہیں کہ مزارع مذکور اپنے کھیتوں کے مزدوروں کو زیادہ اجرت ادا کریں۔

کیونکہ اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ مزدور مذکور اپنی پہلی اجرت کے عوض کام کرنے پر رضا مند نہ ہوں گے۔ پس لگان پیداوار کا وہ حصّہ ہے جو زرخیزی کے لحاظ سے ادنیٰ ترین زمین کے اخراجاتِ زراعت نکال کر باقی رہتا ہے۔ اس کا تعلق صرف زمیندار اور کاشتکار سے ہے اور کسی کو اس سے کچھ واسطہ نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ زمیندار اپنا لگان مزارع کو دے دے مگر اس صورت میں یہ کاشتکار یعنی مزارع اسے اپنے قبضے میں رکھے گا۔ اور اسے قیمت متعارف پر فروخت کرنے سے خود فائدہ اٹھائے گا۔ جب وہ اسے قیمت متعارف پر فروخت کر کے خود فائدہ اٹھا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے کھیت کے مزدوروں کو زیادہ اجرت دے کر یا لگان مذکور کو کم قیمت پر فروخت کر کے عام دستکاروں یا غلّے کے خریداروں کو فائدہ پہنچائے۔

ہم معلوم کر چکے ہیں کہ جائیدادِ شخصی کی صورت میں لگان خود بخود پیدا ہوتا ہے اور نیز ایک خاص اصول ہے جس کے رو سے اس کی مقدار متعین ہوتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ لگان جائیدادِ شخصی کی صورت میں مالک زمین کا حق ہے اور مزارع کو صرف اسی صورت میں مل سکتا ہے کہ مالک زمین اپنی مرضی سے اُس کو عطا کر دے۔ علیٰ ھٰذا القیاس قوانینِ اقتصاد کے رو سے مزارع، مزدور اور خریدار غلہ کو بھی اس سے کوئی سروکار نہیں ہے جب تک مزارع اپنی مرضی سے ان کو عطا نہ کرے۔ مزید برآں یہ امر بھی ظاہر ہے کہ جوں جوں آبادی بڑھتی ہے ضرورت ان زمینوں کو کاشت میں لانے پر مجبور کرتی ہے جو اس سے پہلے غیر مزروعہ پڑی تھیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو زمینیں افزائش آبادی سے پیشتر کاشت کی جاتی تھیں ان کا لگان بڑھ جاتا ہے۔ زمیندار روز بروز دولتمند ہوتے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ مزید دولت جو ان کو ملتی ہے نہ اس کی ذاتی کوششوں اور نہ ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار بڑھنے کا نتیجہ ہوتی ہے، بلکہ صرف آبادی کی زیادتی سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کی ذاتی کوششیں اور ان کی زمینوں کے محاصل کی مقدار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ پھر ان کا کوئی حق نہیں کہ وہ دولت مند ہوتے جائیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کی زیادتی سے قوم کے خاص افراد کو فائدہ پہنچے اور باقی قوم اس سے محروم رہے۔ اگر یہ فائدہ ان کی ذاتی کوششوں یا ان کی زمینوں کے محاصل کے بڑھ جانے کا نتیجہ ہوتا تو ایک بات تھی لیکن جب ان کی دولت

مندی کے یہ اسباب نہیں ہیں، تو صاف ظاہر ہے کہ ان کی امیری صریحاً اصولِ انصاف کے خلاف ہے۔ ان نتائج کو ملحوظ رکھ کر بعض محققین نے بڑے زور شور سے ثابت کیا ہے کہ یہ سب ناانصافی جائداد شخصی سے پیدا ہوتی ہے جس کا وجود قومی بہبودی کے لیے انتہا درجے کا مضرت رساں ہے۔ پس حکماء کے اس فریق کے نزدیک زمین کسی خاص فرد کی ملکیت نہیں بلکہ قومی ملکیت ہونی چاہیے۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ لگان کی یہ زائد مقدار جو آبادی کی زیادتی کے سبب سے پیدا ہوتی ہے سرکار یا قوم کا حق ہے نہ زمینداروں کا۔ یہ ایک بڑی دلچسپ بحث ہے۔ لیکن چونکہ یہ ابتدائی کتاب اس کے لیے موزوں نہیں، اس واسطے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

ساہوکار کا حصّہ یا سود

حصّہ دوم میں معلوم ہو چکا ہے کہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور زمین کے فطری قویٰ، ہوا، پانی وغیرہ اس میں داخل نہیں۔ ظاہر ہے کہ دولت کی پیداوار کا کچھ حصّہ یا بہت زیادہ حصّہ دستکاروں، سرمایہ داروں اور زمینداروں کی ضروریات پر صرف ہوتا ہے۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ پیداوار دولت کی تمام وکمال مقدار اسی طرح صرف نہ ہو جائے، جب تک کہ کوئی ایسی چیز نہ ہو جو دولت کو جذبات نفسانی کے نتیجہ سے چھوڑا کر کسی قوم کے افراد کو جمع کرنے کی ترغیب و تحریص دے۔ مہذب ممالک میں تجارت کی وسعت کے ساتھ جمع کرنے کی خواہش کو بہت تحریک ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس سرمایہ ہو، جس کو خود کسی کام پر لگا کر نفع اٹھاؤں یا کسی اور کو مستعار دے کر اس کے معاوضے میں سود لوں۔ یہ نفع یا سود جو استعمال سرمایہ کے عوض میں ادا کیا جاتا ہے جمع کرنے کا ایک زبردست محرک ہے۔ تاہم اقوام دنیا کے مختلف افراد پر اس کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ سود زر نقد یا روپے کے استعمال کے عوض میں ادا کیا جاتا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ صحیح نہیں۔ کیونکہ اصل مطلب زر نقد نہیں ہے بلکہ وہ اشیاء ہیں جو زر نقد مستعار کی وساطت سے حاصل کی جاتی ہیں اور جن کو بطور سرمایہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مزید برآں زمانۂ حال میں تجارت کے اکثر کاروبار ساکھ یا اعتبار کے بل پر چلتے ہیں۔ اس واسطے خرید و فروخت میں زر نقد کی کبھی کبھی ضرورت پڑتی ہے۔ پس سود استعمال زر نقد کے عوض میں نہیں بلکہ استعمال سرمایہ کے معاوضے میں ادا کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس کی مستقل شرح اس نسبت پر منحصر ہے جو کسی ملک میں قرضوں کی مانگ اور سرمایے کی اس مقدار کے درمیان ہو جو سود پر دی جا سکتی ہو۔ شرح سود کی زیادتی کمی سرمایہ پر دلالت کرتی ہے۔ اور اس کی کمی زیادتِ سرمایہ پر۔ جس سے یہ نتیجہ نکلتا

ہے کہ شرح سود کی زیادتی اقتصادی لحاظ سے غیر مفید نہیں۔ کیونکہ سرمایہ بچت کا نتیجہ ہے اور شرح سود اس بچت کا انعام ہے۔ لہٰذا جس قدر شرح سود زیادہ ہو گی اسی قدر لوگوں کو جمع کرنے کی تحریک ہو گی اور سرمایے کی مقدار بڑھتی جائے گی۔

پس صاف ظاہر ہے کہ کسی ملک میں ایسے قوانین کا وضع ہونا جن کا منشا شرح سود کو کم کرنا یا اس کی زیادتی کو روکنا ہو، گویا ان اسباب کے عمل کو روکنا ہے، جن کی وساطت سے سرمایے کی رسد بڑھتی ہے۔ مگر برعکس اس کے یہ نہ سمجھ لینا کہ کسی ملک میں شرح سود کی کمی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ وہاں کی تمدّنی حالت ہر طرح سے محمود ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں شرح سود کی کمی سرمایے کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ سرمایے کی مقدار اس سرعت اور تیزی کے ساتھ بڑھتی ہے کہ اب اس کے بارآور استعمال کی کوئی مزید صورت رہی ہی نہیں اور نظام تمدن کا شیرازہ ایسا بگڑ گیا ہے اور لوگ اس قدر کاہل و آرام طلب ہو گئے ہیں کہ نئے نئے تجارتی اور صنعتی مشاغل کا بار اٹھانے کی تکلیف گوارا نہیں کر سکتے۔

شرح سود کی زیادتی کے کئی اسباب ہیں۔ لوگ ممالک غیر میں اپنا سرمایہ سود پر نہیں دیتے جب تک کہ زیادہ شرح سود نہ ملے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر ممالک میں شرح سود کی مقدار مساوی نہیں ہوتی۔ مزید برآں شرح سود کی مقدار اس منافع پر بھی انحصار رکھتی ہے جو سرمایے کے استعمال سے حاصل ہو۔ ملک آسٹریلیا کے کسانوں کو زراعت سے بیس فیصدی منافع حاصل ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ لوگ سرمایہ مستعار کے عوض میں شرح سود کی ایک بہت زیادہ مقدار دے سکتے ہیں، بہ نسبت ان ممالک کے جہاں زراعت سے اس قدر منافع حاصل نہیں ہوتا۔ علیٰ ہذا القیاس اشیاء خوردنی کی ارزانی مصارف محنت کو کم کر کے منافع کی مقدار کو زیادہ کرتی ہے جس سے شرح سود کی مقدار بھی بڑھتی ہے۔ برخلاف اس کے سونے چاندی کی نئی نئی کانوں کا دریافت ہو جانا سرمایے کی رسد کو زیادہ کرتا ہے۔ اس واسطے شرح سود کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ اور نیز کسی ملک کے مختلف بنکوں کا باہمی مقابلہ بھی جو ہمیشہ اپنے

اپنے سرمایے کو لگانے کی فکر میں رہتے ہیں، شرح سود کی مقدار کو کم کرتا ہے۔ زمانۂ حال میں مندرجہ ذیل اسباب کے اثر سے شرح سود زیادہ ہوتی گئی ہے۔

۱- وسائل آمد و رفت کی سہولت سے لوگوں کو غیر ممالک میں سرمایہ منتقل کرنا آسان ہو گیا ہے۔ جس ملک سے سرمایہ منتقل ہو گا وہاں اس کی رسد کم ہوتی جائے گی۔ لہٰذا اس ملک میں شرح سود بڑھے گی۔

۲- مختلف ممالک کے ارکانِ سلطنت اخراجاتِ جنگ اور دیگر رفاہ عام کے کاموں میں روپیہ صرف کرنے کے لیے رعایا سے قرض اٹھاتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا، تو سرمایے کی یہ مقدار ملک میں عام طور پر مستعار دی جا سکتی جس سے شرح سود کی مقدار بسبب زیادتی رسد سرمایہ کم ہو جاتی۔

۳- دیگر ممالک سے اشیاء خوردنی وغیرہ کا خرید کرنا کسی ملک کے سرمایے کی مقدار کو کم کرتا ہے جس سے اس ملک میں شرح سود کی مقدار بڑھ جاتی ہے۔

۴- چونکہ مشترک سرمایے والی کمپنیاں قانوناً جائز تصوّر کی گئی ہیں۔ اس واسطے ساہوکاروں میں سے اکثر لوگوں نے متفق ہو کر تجارتی کمپنیاں قائم کر لی ہیں۔ لہٰذا سرمایے کی وہ مقدار جو پہلے سود پر اوروں کو دی جا سکتی تھی تجارت کی مختلف شاخوں میں لگ گئی ہے جس سے اس سرمایے کی مقدار کم ہو گئی ہے جو مستعار دیا جا سکے۔ لہٰذا شرح سود بڑھ گئی ہے۔

تم شاید یہ سمجھو گے کہ شرح سود اور لگان دونوں ایک ہی جنس کی نوعیں ہیں، مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ جوں جوں آبادی زیادہ ہوتی ہے تہذیب و تمدّن ترقی کرتے ہیں اور دولت کی پیداوار بڑھتی ہے توں توں جیسا کہ ہم باب گذشتہ میں بیان کر آئے ہیں، لگان کی مقدار بڑھتی جاتی ہے۔ لیکن شرح سود ان حالات میں بوجہ افزائش سرمایہ کم ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس لگان اور سود میں ایک یہ بھی ضروری فرق ہے کہ مقدّم الذکر، جیسا کہ ہم ثابت کر آئے ہیں، اشیاء کی قیمتوں کا کوئی جزو نہیں ہے لیکن مؤخر الذکر ان کی قیمتوں کا جزو ہے۔ کیونکہ شرح سود کی کمی بیشی اس منافع کی کمی بیشی پر انحصار رکھتی ہے جو تجارت کی کسی شاخ پر سرمایہ لگانے سے حاصل ہوتی ہے اور منافع کی کمی بیشی اشیاء کی قیمتوں

کی کمی بیشی پر منحصر ہے۔ اکثر صورتوں میں ساہوکاروں کو اپنے قرضداروں پر پورا اطمینان نہیں ہوتا، بلکہ بعض صورتوں میں ان کو سرمایے کی عدم ادائیگی یا کسی اور قسم کے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ اپنے قرضداروں کو شرح سود کی ایک غیر معمولی مقدار پر سرمایہ قرض دیتے ہیں اس غیر معمولی شرح سود کو جو احتمال عدم ادائیگی یا نقصان کے اندیشے کی وجہ سے حاصل کی جاتی ہے اصطلاح اقتصاد میں سود کاذب کہتے ہیں۔ کیونکہ شرح سود کی اصلی اور صحیح مقدار وہی ہے جس کی تعیین میں کسی قسم کے اندیشے و نقصان کو دخل نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات ایک تجارتی مرکز میں شرح سود کی مقدار کہیں کچھ اور کہیں کچھ ہوتی ہے۔ قیمت اشیاء کے متعلق تم ایک اقتصادی اصول پڑھ چکے ہو کہ ایک ہی منڈی میں ایک ہی وقت پر ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک ہی ہوتی ہے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اصول شرح سود یا بالفاظ دیگر اس قیمت کے متعلق صحیح نہیں ہے جو استعمال سرمایے کے عوض میں دی جاتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شرح سود کی تعیین میں بسا اوقات احتمال نقصان کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ جہاں روپے کے ضائع ہو جانے کا احتمال ہو وہاں ساہوکار زیادہ شرح سود لے لیتے ہیں۔ اور جہاں نقصان کا احتمال کم ہو یا بالکل نہ ہو یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ جہاں ان کو روپے کے واپس مل جانے اور سود کے باقاعدہ ادا ہوتے رہنے کا پورا یقین ہو، وہاں کم شرح سود پر رضامند ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ لوگ بالعموم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ دنیا میں ان کا بھرم نہ نکل جائے۔ اس واسطے حتی المقدور مستعار سرمایہ لینے کو اوروں سے چھپاتے ہیں اور اس بات کی کوشش نہیں کرتے کہ مختلف ساہوکاروں کے درمیان ایک قسم کی تجارتی ضد یا مقابلہ پیدا کر دیں جس سے شرح سود کی مقدار کم ہو جائے اور ان کو فائدہ پہنچے۔ لہٰذا مستعار سرمایہ لینے والوں کو حالات کا پورا علم نہیں ہوتا اور ساہوکاروں کے درمیان مقابلہ باہمی کامل طور پر اپنا اثر نہیں دکھا سکتا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف ساہوکار شرح سود کی مختلف مقداروں پر روپیہ قرض دیتے ہیں۔

علیٰ ہذا القیاس دنیا کی مختلف تجارت گاہوں میں بھی شرح سود کے اختلاف کے اسباب یہی ہیں جو بیان ہوئے۔ مگر اس خاص صورت میں اختلاف کا ایک اور باعث بھی ہے۔ یعنی

ساہوکار عموماً اپنا سرمایہ غیر ممالک کے لوگوں کو مستعار نہیں دیتے جس سے شرح سود میں مقامی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کو اور باتوں کے علاوہ یہ خیال بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر کسی سبب سے سرمایہ مستعار کی وصولی وغیرہ کے لیے عدالت تک نوبت پہنچی تو اجنبیوں کے ساتھ جھگڑا رگڑا کرنے میں خواہ مخواہ کی دقت ہوگی۔ بسا اوقات اقوام کا باہمی تعصب اور بد ظنی اور قابل اعتماد دلالوں کا دستیاب نہ ہو سکنا بھی ساہوکار کو غیر ممالک میں اپنا سرمایہ لگانے سے روکتا ہے۔ مزید برآں ان کو فطرتاً یہ خیال بھی ہوتا ہے کہ اپنے وطن میں شرح سود کی تھوڑی سی مقدار پر اکتفا کرنا اچھا ہے بجائے اس کے کہ سرمایہ دیگر ممالک میں منتقل کریں، جہاں کے حالات کا کافی علم نہ ہونے کی وجہ سے نقصان کا احتمال ہے۔

مالک یا کارخانہ دار کا حصّہ یا منافع

پیداوار دولت کا تیسرا حصّہ دار مالک یا کارخانہ دار ہے جو صنعت کی مختلف شاخوں کو مرتب و منظم کرتا ہے اور جس کا فرض علاوہ دیگر فرائض کے ایک اس امر کا فیصلہ کرنا بھی ہوتا ہے کہ کون کون سی اشیاء کس کس مقدار میں تیار کی جائیں گی اور کس قیمت پر فروخت کی جائیں گی۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ تمدن انسانی کے ابتدائی مراحل میں مالک یا کارخانہ دار کا وجود ضروری نہیں ہوتا۔ لیکن پیدائشِ دولت کی مختلف صورتوں کا پیچیدہ ہوتے جانا، کلوں کی ایجاد اور تجارت کی وسعت اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ کوئی فرد ایسا بھی ہو، جو دست کاری کے کاروان کے لیے قافلہ سالار کا کام دے اور جس کا ذاتی تجربہ، انتظامی قوت اور تجارت کے نشیب و فراز سے واقف ہونا صنعت کی روز افزوں پیچیدگیوں کو سلجھاتا رہے۔ تم جانتے ہو تمدن کی اعلیٰ صورتوں میں جب کہ صنعت انتہا درجے کی ترقی کر جاتی ہے یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص جس کے پاس سرمایہ موجود ہو مالک یا کارخانہ دار کا کام بھی دے سکے۔ کیونکہ کارخانہ داری کے لیے دیگر اوصاف کے علاوہ ایک خاص قسم کی انتظامی قوت، عاقبت بینی اور ذمہ داریوں کا بار اٹھا سکنے کی قابلیت لازم ہے جس سے بالعموم ہر سرمایہ دار متصف نہیں ہوتا۔ لہذا جس طرح سرمایہ مہیا کرنے کے عوض میں ساہوکار یا سرمایہ دار کو ایک خاص معاوضہ ملتا ہے جو شرح سود کہلاتا ہے، اسی طرح پیدائشِ دولت کے سلسلے میں کارخانہ دار کو بعض فرائض کی انجام دہی کے لیے ایک خاص معاوضہ ملتا ہے جس کو منافع کہتے ہیں۔ اکثر محققین اقتصاد نے کارخانہ دار اور سرمایہ دار یا ساہوکار یا یوں کہو کہ منافع اور سود میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ اس واسطے وہ منافع کو استعمالِ سرمایہ کا معاوضہ سمجھتے ہیں اور اس کے علاوہ جو کچھ کارخانہ دار کو ملتا ہے اسے محض اجرتِ انتظام و نگرانی وغیرہ تصور کرتے ہیں۔ لیکن صاف

ظاہر ہے کہ پیدائش دولت کے سلسلے میں سرمایہ دار اور کارخانہ دار مختلف اقسام کے فرائض ادا کرتے ہیں اور مؤخر الذکر کا حصّہ ایسا بے حقیقت نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے بلکہ اقتصادی لحاظ سے اسے اجرت کے نام سے موسوم کرنا ہی غلط ہے جیسا کہ ابھی واضح ہو گا کہ ہر کارخانہ دار جس میں کارخانہ داری کے اوصاف موجود ہیں سرمایہ دار بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اوروں سے کسی خاص شرح سود پر سرمایہ حاصل کر سکتا ہے۔ خصوصاً اس زمانہ میں جب کہ تجارتی کاروبار کا زیادہ تر حصّہ اعتبار پر چلتا ہے۔ مگر ہر سرمایہ دار یا ساہوکار کارخانہ دار نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ اوصاف جو کارخانہ داری کے لیے ضروری ہوتے ہیں ہر سرمایہ دار میں موجود نہیں ہوتے ہاں اگر کسی سرمایہ دار یا ساہوکار میں کارخانہ داری کے اوصاف موجود ہوں تو وہ دونوں کے فرائض کو انجام دے کر دگنا فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تم جانتے ہو کسی شے کے مصارفِ پیدائش سے مراد ان اخراجات کی ہے، جو اس شے کی تیاری اور اس کو خرید و فروخت کے مقام وغیرہ پر لانے میں صرف ہوتے ہیں۔ کارخانہ دار کی خواہش اور امید یہ ہوتی ہے کہ اس شے کی قیمت فروخت یا قدر اس کے مصارفِ پیدائش سے بڑھ جائے۔ لہٰذا منافع اس فرق کے برابر ہوتا ہے جو کسی شے کی قیمت فروخت اور اس کے مصارفِ پیدائش کے درمیان ہو۔ بشرطیکہ مقدم الذکر مؤخر الذکر سے مقدار میں زیادہ ہو۔ کیونکہ اگر قیمت فروخت مصارفِ پیدائش سے کم ہو گی تو اس سے کارخانہ دار کو منافع نہیں ہو گا بلکہ گھاٹا ہو گا۔ تجارت اشیاء میں یہ نفع جو کارخانہ دار کو ہوتا ہے منافع کہلاتا ہے۔ اور قرضوں کی تجارت کی صورت میں اس نفع کو منافع کے نام سے نہیں بلکہ سود یا مٹی کاٹے کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ وسیع معنوں میں منافع کا مفہوم یہی ہے جو بیان ہوا۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ منافع کی حقیقت پر بحث کرنے والوں میں سے بعض نے ایک بڑی غلطی کھائی ہے۔ جس طرح شرح سود سے مراد ایک خاص مقدار کی ہے جو سرمایے کو ایک خاص مدت تک استعمال کرنے کے عوض میں ادا کی جاتی ہے۔ اسی طرح شرح منافع سے مراد منافع کی ایک خاص مقدار ہے جو ایک خاص مدّت میں حاصل ہو۔ مگر بعض محققین غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ شرح منافع کی تعیین میں مدّت کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور شرح منافع صرف مقادیر منافع

اور سرمایے کی درمیانی نسبت پر منحصر ہے۔ مگر یہ رائے صریحاً غلط ہے۔ فرضاً اگر میں تجارت کی کسی شاخ پر سو روپیہ سرمایہ لگاؤں اور مجھے پانچ روپے یومیہ منافع ہو تو صاف ظاہر ہے کہ شرح منافع فی ماہ ۱۵۰ روپے فی صدی ہے۔ لیکن اگر اس قدر منافع دو ماہ کی میعاد میں حاصل ہو تو شرح منافع ۷۵ روپے فی صدی فی ماہ ہو گی نہ ۱۵۰ فی صدی۔ لہٰذا شرح منافع کی مقدار نہ صرف سرمایے کی مقدار پر منحصر ہے بلکہ اس مدّت پر بھی انحصار رکھتی ہے جس میں منافع کی کل مقدار حاصل ہو۔ جس قدر کسی شے کی قیمت فروخت اس کے مصارفِ پیدائش سے زیادہ ہو گی اسی قدر شرح منافع کی مقدار بھی زیادہ ہو گی اور جس قدر قیمت فروخت کم ہو گی اسی قدر شرح منافع کی مقدار بھی کم ہو گی۔ علیٰ ہذا القیاس اگر اس مدّت کی مقدار جس میں کل منافع حاصل ہوا ہے کم ہو گی تو شرح منافع کی مقدار زیادہ ہو گی اور اگر مقدم الذکر کی مقدار زیادہ ہو گی تو مؤخر الذکر کی مقدار کم ہو گی۔ مثلاً اگر سرمایے کی کسی خاص مقدار کے عوض دو ماہ میں پچاس روپے منافع ہو، تو شرح منافع فی ماہ پچیس روپیہ ہو گی۔ لیکن اگر یہ پچاس روپیہ منافع پانچ ماہ میں حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ شرح منافع فی ماہ دس روپیہ ہو گی۔ لہٰذا شرح منافع کے متعلق یہ ضروری اصول قائم ہوا کہ ''شرح منافع مصارفِ پیدائش اور اس مدّت کے ساتھ جس میں منافع کی کل مقدار حاصل ہو نسبت معکوس رکھتی ہے۔'' اس ذرا سی بات کو نہ سمجھنے کے باعث بعض محققین نے بڑی بڑی غلطیاں کھائی ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ منافع کی مقدار صرف اسی صورت میں زیادہ ہو سکتی ہے جب کہ اجرت کی مقدار کم ہو۔ اور اسی صورت میں کم ہو سکتی ہے جب کہ اجرت کی مقدار زیادہ ہو۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک کارخانہ داروں اور محنتیوں کے سود وزیاں کے درمیان ایک قسم کا ضروری تناقض ہے یا یوں کہو کہ ایک کا نفع اور دوسرے کا نقصان ہے لیکن جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا ہے شرح منافع کی تعیین میں مدت کو بھی بڑا دخل ہے۔ یعنی اگر سرمایے اور منافع کی مقادیر میں کوئی تغیر پیدا نہ ہو تو جس مدّت میں منافع کی ایک خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اس مدّت کے کم ہو جانے یا یوں کہو کہ اشیاء تجارتی کے بہت جلد فروخت ہو جانے سے شرح منافع بڑھ جاتی ہے اور اس مدّت کی زیادتی سے شرح منافع کم ہو جاتی ہے خواہ اجرت کی مقدار میں فرق پیدا

ہو یا نہ ہو۔ علیٰ ہذا القیاس یہ بھی ممکن ہے کہ اجرت کی مقدار بڑھ جاوے اور منافع کی مقدار کم ہو جائے۔ مگر باوجود اس کے شرح منافع زیادہ ہو جائے۔ مثلا فرض کرو کہ سرمایہ ایک سو پونڈ کے برابر ہے، اور منافع سالانہ بیس پونڈ ہے۔ اگر بیس پونڈ منافع ایک ماہ میں حاصل ہو تو ظاہر ہے کہ شرح منافع کی مقدار ۲۴۰ پونڈ سالانہ فی صدی ہو گی۔ فرض کرو کہ شرح منافع میں اس قدر زیادتی ہو جانے سے سرمایہ دار پانچ پونڈ بطور اجرت ادا کرتا ہے۔ اس صورت میں مصارفِ پیدائش ۱۰۵ پونڈ ہوئے اور منافع ماہانہ ۳ء ۱۴ یا قریباً ۱۵ پونڈ فی صدی ہوا۔ لہٰذا شرح منافع ۱۶۷ پونڈ فی صدی سے بھی زیادہ ہوئی۔ لیکن فرض کرو کہ مدت منافع اس سے بھی بڑھ گئی ہے اور منافع کی مقدار بجائے بیس پونڈ فی ماہ کے بیس پونڈ فی یوم ہو گئی یا یوں کہو کہ شرح منافع ۷۳۰۰ پونڈ سالانہ فی صدی ہے۔ اگر شرح منافع میں اس قدر زیادتی ہو جانے سے ۱۰ پونڈ بطور اجرت ادا کیے جاویں تو ظاہر ہے کہ ۱۱۰ پونڈ لگانے پر ۱۰ پونڈ یومیہ منافع ہو گا۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ شرح منافع فی یوم ۹ فیصدی سے زیادہ یا ۳۳۱۸ سالانہ فی صدی سے زیادہ ہے۔ اس مثال سے ظاہر ہے کہ اس مدت کی کمی سے جس میں منافع کی کوئی خاص مقدار حاصل ہوتی ہے اجرت اور شرح منافع ایک ساتھ بڑھ سکتے ہیں۔ اگرچہ منافع مجموعی طور پر کم ہی کیوں نہ ہو تا جائے۔ لہٰذا دستکاروں و خریداروں اور کارخانہ داروں کے نفع و نقصان کے درمیان کوئی تناقض نہیں ہے اور شرح منافع مختصراً مندرجہ ذیل اسباب پر منحصر ہے۔

۱- وہ تمام اسباب جو اشیاء تجارتی کے مصارفِ پیدائش کو کم کرتے ہیں۔ منافع کی کل مقدار کو زیادہ کرتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ شرح منافع بھی اسی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔ مگر مصارفِ پیدائش صرف اسی صورت میں کم ہو سکتے ہیں کہ:

۱- دستکار کی کارکردگی بڑھ جائے اور اس کی اجرت بدستور وہی رہے۔

۲- اجرت کم ہو جائے اگرچہ محنت کی کارکردگی اور اشیاء خوردنی وغیرہ کی قیمت خرید بدستور ہی رہے۔

۳- اشیاء خوردنی وغیرہ ارزاں ہو جائیں مگر دستکار کو ان کی اس قدر مقدار مل سکے جو پیشتر ملا کرتی تھی۔ برخلاف اس کے اگر کمی تعلیم یا سرمایہ قائم مثلاً کلوں وغیرہ کے تلف ہو

جانے یا دستکار کی جسمانی قوت میں زوال آجانے کے باعث محنت کی کارکردگی کم ہوجائے یا دستکار کی اجرت بڑھ جائے، مگر اشیاء خوردنی ارزاں نہ ہوں یا اجرت بدستور ہی رہے اور اشیاء خوردنی وغیرہ گراں ہوجائیں، تو منافع کی مقدار کم ہوگی۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ شرح منافع کی مقدار بھی اسی نسبت سے کم ہوگی بشرطیکہ اس مدّت میں کوئی تغیر نہ ہو جس میں کل منافع کی مقدار حاصل ہوتی ہے۔

ب-شرح منافع کی تعیّین میں چونکہ مدّت کو بھی دخل ہے لہٰذا اگر وہ مدّت جس میں منافع کی کوئی خاص مقدار حاصل ہوتی ہے، کم ہوجائے تو شرح منافع زیادہ ہوگی۔

منافع کی زیادتی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مصالح جس سے تجارتی اشیاء تیار ہوتی ہیں، مانگ کے بڑھ جانے کی وجہ سے گراں ہوجاتا ہے اور لوگ تجارت کی دیگر شاخوں سے اپنا سرمایہ نکال کر اس خاص شاخ میں لگانا شروع کردیتے ہیں جہاں شرح منافع نسبتاً زیادہ ہے۔ مگر یہ حالت دیر تک نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ سرمایے کی زیادتی سے اشیاء کی رسد ان کی مانگ سے بڑھ جاتی ہے۔ لہذا قیمتیں کم ہوجاتی ہیں اور شرح منافع اپنی پہلی حالت پر عود کر آتی ہے بلکہ بسا اوقات معمول سے کم بھی ہوجاتی ہے۔

ماہیت منافع کی مزید توضیح کے لیے محقق واکر لکھتا ہے کہ اگرچہ لگان اور سود (ان کا فرق پہلے واضح ہوچکا ہے) میں بڑا فرق ہے۔ تاہم منافع اور لگان ایک ہی جنس کی دو نوعیں ہیں جس طرح لگان کی مقدار بسبب زمین کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کا کسی خاص مناسب مقام پر واقع ہونا ہے۔ اسی طرح منافع کی مقدار بھی کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت اور اس کی غیر معمولی انتظامی قوت و عاقبت اندیشی پر انحصار رکھتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس جس طرح مقدم الذکر کی تعیین میں مختلف زمینوں کے لگانوں کا باہمی مقابلہ بڑا دخل رکھتا ہے۔ اسی طرح مختلف کارخانہ داروں کے منافع کی مقدار کے معین کرنے میں بھی ان کے اوصاف کا باہمی مقابلہ بڑا دخل رکھتا ہے۔ جس طرح بعض ایسی زمینیں ہیں جو کم لگان ادا کرتی ہیں، اسی طرح بعض ایسے کارخانہ دار بھی ہیں جو کم منافع حاصل کرتے ہیں۔ ہر ملک میں سینکڑوں ایسے تاجر یا کارخانہ دار ہیں جو حقیقت میں ان اوصاف سے بے بہرہ ہیں جو کارخانہ داروں کے لیے

ضروری ہیں اور جن کا منافع بمشکل ان کے گزارہ کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اقتصادی استدلال کے لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے کارخانہ داروں کو منافع کچھ نہیں ہوتا۔ اس توضیح سے حقیقت منافع کے متعلق دو نہایت اہم نتائج نکلتے ہیں جن کو ذہن نشین کر لینا نہایت ضروری ہے۔

۱- منافع اشیاء صنعتی کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ یہ اس دولت کا ایک حصہ ہے جو کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت اور اس کی غیر معمولی قوتِ انتظام کی وساطت سے پیدا ہوتی ہے۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ لگان زرعی پیداوار کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے بلکہ اس دولت کا ایک حصّہ ہے جو زمین کی غیر معمولی زرخیزی اور اس کے کسی خاص مقام پر واقع ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ جس استدلال کی بنا پر یہ بات لگان کے متعلق صحیح ثابت کی گئی تھی اسی استدلال کی رو سے یہ بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ منافع اشیاء صنعتی کی قیمت کا کوئی جزو نہیں ہے۔ صنعتی اشیاء کی قیمت اشیاء مذکور کے اس حصہ کے مصارفِ پیدائش سے متعین ہوتی ہے جو نہایت نامساعد حالات میں پیدا کیا گیا ہو۔ لیکن چونکہ اقتصادی اصولوں کے رو سے ایک ہی منڈی میں ایک ہی قسم کی اشیاء کی قیمت ایک وقت پر ایک ہی ہوتی ہے، لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ جو کارخانہ دار ان کارخانہ داروں کی نسبت جو نہایت نامساعد حالات میں کام کرتے ہیں کم مصارف پر اشیاء صنعتی تیار کر سکتے ہیں وہ منافع حاصل کریں گے۔ کیونکہ قیمت اشیاء دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے اور مصارفِ پیدائش ایک صورت میں کم اور دوسری میں زیادہ ہیں۔

۲- علیٰ ہذا القیاس یہ صحیح نہیں ہے کہ کارخانہ دار کا منافع صرف اسی صورت میں بڑھ سکتا ہے جب کہ اجرت کم ہو۔ کیونکہ اجرت کی جو مقدار ان کارخانہ داروں کو ادا کرنی پڑتی ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے مزین ہونے کے باعث منافع حاصل کرتے ہیں، وہی مقدار اوروں کو بھی ادا کرنا پڑتی ہے جو ان اوصاف سے معرا ہونے کے باعث اقتصادی لحاظ سے کوئی منافع حاصل نہیں کرتے یا صرف برائے نام منافع حاصل کرتے ہیں۔ اجرت کی مقدار دونوں میں مساوی ہے۔ مگر ایک صورت میں منافع ہوتا ہے، دوسرے میں کوئی منافع نہیں

ہوتا یا صرف برائے نام منافع ہوتا ہے۔ جس کے یہ معنے ہیں کہ حصول منافع کارخانہ دار کی ذاتی قابلیت کا نتیجہ ہے۔

جس طرح عمدہ زمینوں کا لگان بری زمینوں کے لگان سے مقدار میں زیادہ ہوتا ہے اسی طرح ہشیار اور معاملہ فہم کارخانہ داروں کا منافع ان کارخانہ داروں کے منافع سے زیادہ ہوتا ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے معرا ہوتے ہیں۔ آبادی و تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ ادنی درجے کی زمینیں کاشت میں لانی پڑتی ہیں اور زرخیز قطعات زمین کا لگان بڑھتا جاتا ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس جوں جوں ایسے کارخانہ داروں کی تعداد بڑھتی ہے جو اوصاف کارخانہ داری سے معرا ہیں، توں توں ان کارخانہ داروں کا منافع بڑھتا ہے جو ان اوصاف سے بہرہ ور ہیں۔ کیونکہ کارخانہ دار کی ناقابلیت کی وجہ سے مصارفِ پیدائش بڑھ جاتے ہیں۔

اس ضمن میں یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کسی ملک کا تہذیب و تمدن میں ترقی کرنا اس امر کا مقتضی ہے کہ وہاں شرح منافع روز بروز کم ہوتی جانے کا میلان رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ملک میں ناقابل کارخانہ داروں کی تعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے۔ لہٰذا ان کارخانہ داروں کا منافع روز بروز کم ہوتا جاتا ہے جو ذاتی قابلیت کا جوہر رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے منافع کی زیادتی ناقابل کارخانہ داروں کی تعداد پر منحصر ہے۔ علاوہ اس کے ایسے ملک میں عام لوگ دور اندیش ہو جاتے ہیں، جس سے سرمایہ زیادہ سے زیادہ جمع ہو جاتا ہے لہٰذا اس کی رسد بڑھتی جاتی ہے اور شرح منافع کم ہوتی جاتی ہے، کیونکہ شرح منافع کی زیادتی کا ایک باعث یہ بھی ہے کہ سرمایہ کی رسد کم ہو۔ مزید برآں تہذیب و تمدّن کی ترقی سے آبادی بڑھتی ہے۔ جس سے ادنی درجے کی زرخیز زمینیں کاشت میں لانی پڑتی ہیں۔ لہٰذا مصارفِ پیدائش اور اشیاء خوردنی کی قیمت بڑھ جاتی ہے جس سے شرح منافع کی مقدار بھی کم ہو جاتی ہے۔ مگر تم کہو گے کہ اگر یہ صحیح ہے، تو انگلستان میں تہذیب و تمدّن کی ترقی کے ساتھ شرح منافع پر کیوں بڑا اثر نہیں ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انگلستان کے سرمایے کا بہت سا حصّہ غیر ممالک میں لگا ہوا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ خود انگلتسان میں سرمایے کی رسد کم ہے۔ انگلستان میں دستکاری کی ترقی اور اشیاء خوردنی کی ارزانی کے باعث جو دیگر ممالک سے آتی ہیں

مصارف محنت کی مقدار زیادہ نہیں ہوتی، لہذا اس ملک میں شرح منافع میں نہایت خفیف کمی واقع ہوئی ہے۔

چونکہ دستکار بالعموم کارخانہ دار کے نفع کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس واسطے بعض محققین اقتصاد دستکاروں کے فائدے کو مد نظر رکھ کر یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ اگر دستکار خود ہی محنتی ہو اور خود ہی کارخانہ دار ہو تو دستکاری کے موجودہ انتظام میں کارخانہ دار کا وجود ضروری نہ ہوگا۔ اور وہ منافع جو موجودہ صورت میں کارخانہ دار کی جیب میں جاتا ہے دستکار کو ملے گا۔ یہ طریق اصول معاونت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

باب چہارم

محنتی کا حصّہ یا اجرت

پیداوار دولت کا چوتھا حصہ دار دستکار یا محنتی ہے جس کا معاوضۂ محنت اجرت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مگر پیشتر اس کے کہ ہم وہ اصول معلوم کریں جس کے عمل پر اجرت کی کمی بیشی کا انحصار ہے، دو ضروری امتیاز ذہن نشین کرنے کے قابل ہیں تاکہ مضمون زیر بحث کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ا- ظاہری اجرت سے زر نقد کی وہ مقدار مراد ہے جو بطور معاوضہ محنت کے ادا کی جائے مگر حقیقی اجرت سے مراد اُن ضروریاتِ زندگی یا دیگر اشیاء تن آسانی وغیرہ کی ہے جو اس زر نقد کی وساطت سے دستکار کو میسر ہو سکیں۔ ممکن ہے کہ مختلف ممالک اور دستکاری کی مختلف شاخوں میں ظاہری اجرت کے مقادیر مساوی ہوں اور حقیقی اجرت کے مقادیر مندرجہ ذیل اسباب کے عمل سے مختلف ہوں۔

ا- مختلف ممالک میں زر نقد کی قوت خرید مختلف ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ملک میں چار آنے کے ایک سیر چاول بکتے ہوں، لیکن کسی اور ملک میں اس سکے کے عوض دو سیر چاول مل سکتے ہوں۔ لہٰذا اگر دونوں ملکوں میں کسی دستکار کی اجرت چار آنے یومیہ ہو تو صاف ظاہر ہے کہ جس ملک میں چار آنے کی قوت خرید زیادہ ہے، وہاں کے دستکاروں کی حقیقی اجرت بھی زیادہ ہے، اگرچہ ظاہری اجرت کی مقداریں دونوں ملکوں میں مساوی ہیں۔

ب۔ مختلف ممالک میں ادائیگی اجرت کی مختلف صورتیں ہیں۔ بعض مقامات میں دستکار کے مکان کا کرایہ اس کی خورد و نوش کی چیزیں یا مرغزار میں مویشی چرانے یا ایندھن کی کوئی خاص مقدار لے لینے کا حق بھی اس کی ظاہری اجرت پر اضافہ ہوتا ہے اس واسطے ممکن ہے کہ دو ملکوں میں کسی خاص قسم کے پیشہ وروں کی ظاہری اجرت مساوی ہو لیکن ان

کی ادائیگی اجرت کے مختلف دستور مروج ہونے کی وجہ سے ایک میں حقیقی اجرت کی مقدار زیادہ ہو اور دوسرے میں کم۔ اکثر مغربی ممالک میں خاص خاص پیشہ وروں کو حق اجرت کے علاوہ بعض دیگر حقوق بھی حاصل ہیں جن کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ خصوصاً جب کہ مختلف ممالک کی مقادیر اجرت کا مقابلہ کرنا مقصود ہو۔

ج۔ بعض پیشوں میں دستکار کی بی بی اور اس کے بال بچوں کو بھی ہاتھ بٹانے کا موقع مل جاتا ہے۔ بلکہ اکثر صورتوں میں بی بی کی کمائی میاں کے مساوی ہو جاتی ہے۔ مثلاً بافندگی میں ایسا ہو سکتا ہے لیکن بڑھئی اور کسان کا پیشہ اس قسم کا ہے کہ بی بی اور بال بچے ان کے کام میں حصّہ نہیں لے سکتے۔

د۔ بعض پیشے قدرتاً اس قسم کے ہوتے ہیں کہ ان میں دستکار اپنے کام کو بالتواتر جاری نہیں رکھ سکتا۔ لہٰذا ان پیشوں میں دیگر پیشوں کی طرح ایسا نہیں ہوتا کہ دستکار کو بالترتیب روزمرہ محنت کرنی پڑے۔ اس عدم تواتر کے کئی وجوہ ہیں:

۱۔ خاص خاص پیشوں کی قدرتی ضروریات

۲۔ موسم کا اثر

۳۔ بعض تمدّنی اسباب

۴۔ بعض اسباب جو خود دستکاروں کے طرز عمل سے پیدا ہوتے ہیں مثلاً جب وہ کارخانہ داروں سے زیادہ اجرت لینے کی خاطر کاروبار چھوڑ دیتے ہیں اور کئی کئی دنوں تک بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔ فن زراعت میں اجرت کی شرح مختلف موسموں میں مختلف ہوتی ہے۔ بسا اوقات سال کی تیسری سہ ماہی میں پہلی سہ ماہی کی نسبت اجرت کی شرح اوّل دو اسباب کے عمل سے دگنی ہو جاتی ہے۔ مگر اس اختلاف کا باعث صرف موسموں کا تغیر ہی نہیں ہے بلکہ فن زراعت کی قدرتی ضروریات بھی کچھ ایسی ہی واقع ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ پیشہ اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ کسان بیج بونے کے بعد اس کے اگنے تک انتظار کریں۔ علیٰ ہذا القیاس بعض پیشوں میں اختلافِ اجرت صرف اختلافِ موسم کا نتیجہ ہوتا ہے مثلاً اینٹیں بنانا اور مکانوں پر نقش و نگار کرنا ایسے کام ہیں کہ ان کی ضرورت ہر روز اور ہر موسم میں نہیں پڑتی۔ ان تمدّنی

اسباب میں جو مختلف ممالک میں پیشوں کے تواتر محنت پر اپنا اثر کرتے ہیں ایک یہ بھی ہے کہ بعض ممالک میں بعض تیوہار اور مذہبی رسومات کئی کئی دن تک رہتے ہیں۔ بلکہ اکثر ممالک میں تیوہار کی تعداد سال میں سو دن سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ پس یہ تمام اسباب مختلف ممالک اور مختلف پیشوں میں دستکاری کی حقیقی اجرت میں اختلاف پیدا کرتے ہیں، خواہ ان کی ظاہری اجرت کی شرح مساوی ہی کیوں نہ ہو۔

ر۔ بعض ممالک اور بعض پیشوں میں دستکار بہ نسبت دیگر ممالک اور دیگر پیشوں کے زیادہ عمر تک زندہ رہتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر دو دستکار ایک ہی عمر میں اور ظاہری اجرت کی ایک ہی مقدار کے عوض میں بارآور طور پر محنت کرنا شروع کریں تو وہ دستکار جو زیادہ عمر تک زندہ رہے گا، حقیقی اجرت کی زیادہ مقدار حاصل کرے گا۔

۲- دوسرا امتیاز جس کا ذہن نشین کرنا لازم ہے۔ اجرت یا ظاہری مصارف محنت اور حقیقی مصارفِ محنت کے درمیان ہے۔ ظاہری مصارفِ محنت سے مراد اجرت کی وہ مقدار ہے جو کارخانہ داروں کو ادا کرنی پڑتی ہے اور اس کی کمی بیشی ضروریات زندگی یا اشیاء تن آسانی وغیرہ کی اس مقدار کی کمی بیشی پر منحصر ہے جو دستکار کو اپنی اجرت کے عوض میں میسر ہو سکے۔ لیکن حقیقی مصارفِ محنت کی مقدار اُس معاوضے کی تعداد پر منحصر ہے جو کارخانہ داروں کو دستکاروں کے کام پر لگانے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ادائیگی اجرت کے عوض میں ملتی ہے۔ خواہ ظاہری مصارفِ محنت یا اجرت کی مقدار جو وہ اپنے دستکاروں کو ادا کرتا ہے، کم ہو یا زیادہ۔

ممکن ہے کہ کارخانہ دار کو ظاہری مصارفِ محنت یا اجرت کی ایک بہت بڑی مقدار ادا کرنی پڑے، مگر حقیقی مصارفِ محنت دستکار کی ہنر مندی اور اس کی محنت کی کارکردگی وغیرہ کی وجہ سے کم ہوں۔ برخلاف اس کے یہ بھی ممکن ہے کہ کارخانہ دار اجرت کی ایک ایسی قلیل مقدار ادا کرے جو بمشکل دستکاروں کے گزارے کے لیے کافی ہو۔ مگر سستی، غفلت، بے ہنری، اور بھدا کام کرنے کے باعث ان کی تیار کردہ اشیاء کی فروخت سے اجرت کی وہ مقدار بھی کارخانہ دار کے پلّے نہ پڑے، جو اس نے ادا کی ہے۔ کاری گر کفش دوز جو زیادہ

اجرت لیتا ہے، چمڑے کی کتر بیونت اس ذکاوت سے کرتا ہے کہ ایک گز کے چار جوڑے بوٹ بنالیتا ہے۔ مگر بے ہنر کفش دوز اسی قدر چمڑے کے تین جوڑے بھی مشکل سے بنا سکتا ہے۔ لہٰذا مقدم الذکر کو کام پر لگانے سے کارخانہ دار کو منافع ہوگا اور مؤخر الذکر کو کام پر لگانے سے نقصان یا یوں کہو کہ پہلی صورت میں کارخانہ دار کے حقیقی مصارفِ محنت کم ہوں گے اور دوسری صورت میں زیادہ۔ فرض کرو کہ دو کفش دوز ہیں جن میں سے ایک کی یومیہ اجرت ایک روپیہ ہے مگر پہلے کا بنایا ہوا بوٹ جس پر لاگت ایک روپیہ آتی ہے اس کی کاریگری کی وجہ سے چار روپیہ قیمت پاتا ہے۔ اور دوسرے کا بنایا ہوا بوٹ جس پر اس کے کم درجے کا کاریگر ہونے کی وجہ سے ایک روپیہ چار آنے لاگت آتی ہے تین روپیہ قیمت پاتا ہے صاف ظاہر ہے کہ پہلی صورت میں ایک روپیہ اجرت ادا کرنے کا معاوضہ دستکار کے بھدا کام کرنے کے باعث صرف بارہ آنے ہے۔ ظاہری مصارفِ محنت دونوں صورتوں میں مساوی ہیں۔ تاہم پہلی صورت میں دستکار کی ہنرمندی کی وجہ سے حقیقی مصارف کم ہیں اور دوسری صورت میں دستکار کے کم درجہ کا کاری گر ہونے کے باعث زیادہ ہیں۔ کیونکہ پہلی صورت میں ایک روپیہ اجرت دینے کا معاوضہ دو روپے ملتا ہے اور دوسری صورت میں صرف بارہ آنے۔ غالباً یہ صحیح ہے کہ زیادہ سے زیادہ اجرت پانے والے دستکار وہی ہوتے ہیں جن کی محنت سے کارخانہ دار کو حقیقی مصارفِ محنت کی کم سے کم مقدار ادا کرنی پڑے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب کارخانہ دار اپنے دستکاروں کی تعداد کو کم کرنا چاہتے ہیں تو وہ پہلے بالعموم انھی دستکاروں کو چھٹی دیتے ہیں جن کی اجرت سب سے کم ہو۔ کیونکہ ان کی محنت سے حقیقی مصارفِ محنت کی مقدار بڑھتی ہے۔ اس کے علاوہ جن قوموں میں حقیقی اجرت کی شرح نہایت قلیل ہوتی ہے بالعموم وہی قومیں اس بات پر مجبور ہوتی ہیں کہ دیگر ممالک کی تیار شدہ اشیاء پر جہاں اجرت کی مقدار بہت زیادہ ہے اس قدر محصول لگاویں کہ وہ ان کے ملک میں بک نہ سکیں۔ ہندوستان میں روئی کاتنے والی کی اجرت بوجہ اس کے بھدا کام کرنے کے ایک روپیہ چار آنے فی ہفتہ ہے، مگر انگلستان میں ایسے دستکار کی اجرت بوجہ اس کی کاریگری کے فی ہفتہ پندرہ روپے ہے۔ اس واسطے مؤخر الذکر ملک میں مقدار اجرت کے زیادہ ہونے کے

باعث حقیقی مصارفِ محنت کی مقدار بہت کم ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ وہاں کے کارخانہ دار اپنی تیار کردہ اشیاء کو دیگر ممالک میں کم قیمت پر بیچ کر بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انگلستانی کپڑے کی کثیر مقدار آتے رہنے کے باعث ہمارے دیسی کپڑے کی تجارت معدوم ہو گئی ہے۔ کیونکہ ہمارے ملک میں بسبب کمی اجرت حقیقی مصارفِ محنت کی مقدار بہت زیادہ ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہمارے کارخانہ دار انگریزی کارخانہ داروں کی طرح کم قیمت پر کپڑا بیچ کر فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ اس واسطے مجبوراً تجارت کی اس شاخ کو ہی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ لہٰذا ہندوستان کی موجودہ اقتصادی حالت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ انگلستان کے کپڑے پر محصول لگایا جائے تاکہ ہمارے ملک کی اپنی صنعت کو ترقی ہو۔ انگلستان کا کپڑا نفیس بھی ہوتا ہے اور سستا بھی۔ اس واسطے یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ایسے کپڑے کے سامنے ہندوستان میں کپڑے کی صنعت چمک سکے، جہاں کے دستکار بھدا کام کرنے والے ہیں اور جہاں کے کارخانہ داروں کو حقیقی مصارفِ محنت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ادا کرنا پڑتی ہے۔

اس توضیح کے بعد ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ مقدار اجرت کی کمی بیشی کس بات پر منحصر ہے۔ اکثر انگریزی محققین اس بات پر متفق ہیں کہ کل سرمایے کا کچھ حصّہ ادائیگی اجرت کے لیے علیٰحدہ نکال کر رکھ لیا جاتا ہے۔ جس کی مقدار ہر ملک میں اقتصادی اسباب کے عمل سے قدرتاً متعین ہو جاتی ہے۔ سرمایہ کی یہ معیّن مقدار سرمایۂ اجرت کہلاتی ہے۔ اور مختلف دستکاروں پر مقابلے کے اثر سے منقسم ہوتی ہے۔ اگر ایک دستکار کو زیادہ اجرت ملتی ہے تو ضرور ہے کہ دوسرے کو کم ملے اور اس واسطے ہر دستکار کی اجرت بحساب اوسط سرمایۂ اجرت کی مقدار اور تعداد دستکاروں کی درمیانی نسبت سے متعین ہوتی ہے۔ یعنی اگر سرمایۂ اجرت کی مقدار دستکاروں کی درمیانی نسبت سے متعین ہوتی ہے یعنی اگر سرمایۂ اجرت کی مقدار زیادہ ہے اور دستکاروں کی تعداد کم تو دستکاروں کو زیادہ اجرت ملے گی اور اگر سرمایۂ اجرت کی مقدار کم ہے اور دستکاروں کی تعداد زیادہ تو ان کی اجرت کم ہو گی۔ پس ان حکماء کے نزدیک سرمایۂ اجرت کی مقدار دستکاروں کی تعداد سے بالکل متاثر نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ ایک ایسی مقدار ہے جو اقتصادی اسباب کے عمل سے ہر ملک میں خود بخود معین ہو جاتی ہے

اور یہ کوئی ضرور نہیں کہ اگر کسی ملک میں دستکاروں کی تعداد بڑھ گئی ہے تو سرمایۂ اجرت کی مقدار بھی بڑھ جائے۔ غرض کہ یہ حکماء لگان اور اجرت کو نکال کر پیداوار دولت کے باقی حصّے کو اس شخص کا حق قرار دیتے ہیں جو ساہوکار بھی ہو اور کارخانہ دار بھی۔

مگر امریکہ کے مشہور محقق واکر اس مسئلہ کی نہایت زور سے تردید کرتے ہیں اور انگریزی محققین کی تحریروں پر مندرجہ ذیل اعتراض کرتے ہیں۔

۱- یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اجرت ہر حالت میں سرمایے کی مقدار میں سے ادا کی جائے جو کارخانہ دار کے پاس پہلے سے جمع ہو۔ انگریزی محققین کا یہ مسئلہ صرف انگلستان کے حالاتِ اقتصادی کے مشاہدے کا نتیجہ ہے، جہاں سرمایے کی بہت سی مقدار پہلے سے جمع تھی اور جہاں دستکاروں کی اجرت گذشتہ سالوں میں اس قدر خفیف رہی ہے کہ ان کو روزمرّہ کی ضروریاتِ زندگی کے لیے مجبوراً اپنے کارخانہ دار کا منہ تکنا پڑتا تھا۔ کیونکہ وہ بسبب کم استطاعتی کے اپنی تیار کردہ اشیاء کی فروخت تک انتظار نہ کرسکتے تھے۔ صوبجات متحدہ امریکہ میں چونکہ دستکاروں کی مالی حالت اچھی ہے اس واسطے کارخانہ دار اشیاء کی فروخت کے بعد اجرت ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ وہاں کے دستکار اپنی اپنی ضرورت کے مطابق فروخت اشیاء سے پہلے بھی اپنی اجرت کا کچھ حصّہ لے سکتے ہیں۔

۲- اگر کارخانہ دار اپنے دستکاروں کو روز اجرت دے بھی دیا کریں، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اجرت کی مقدار سرمایۂ اجرت کی مقدار سے معین ہوتی ہے۔ کیونکہ کارخانہ دار اپنا موجودہ سرمایہ خرچ کرنے کی غرض سے نہیں بلکہ مزید دولت پیدا کرنے کی غرض سے لگاتا ہے۔ جس سے اس کو منافع کی توقع ہوتی ہے۔ یہ دولت جو دستکاروں کی محنت سے پیدا ہوئی ہے زیادہ ہو تو کارخانہ دار مذکور اجرت بھی زیادہ ادا کرسکے گا اور اگر اس کی مقدار کم ہو تو وہ اپنے نفع کے خیال سے اجرت بھی کم ادا کرسکے گا۔ لہٰذا اجرت کی مقدار دستکاروں کی پیداوار محنت کی قدر پر منحصر ہے۔ جس قدر اس کی پیداوار محنت کی قدر زیادہ ہوگی یا یوں کہو کہ جس قدر دستکار اپنی محنت کی کارکردگی اور ہنرمندی کی وجہ سے مزید دولت پیدا

کرے گا، اسی قدر اس کی اجرت بھی زیادہ ہو گی۔ پس اجرت حقیقت میں دستکار کی پیداوار محنت میں سے ادا کی جاتی ہے نہ سرمایۂ اجرت میں سے جو کارخانہ دار کے پاس موجود ہو۔

۳۔ چونکہ دلیل مندرجہ بالا کے مطابق اجرت کی مقدار دستکاروں کی پیداوار محنت کی مقدار سے متعیّن ہوتی ہے۔ اس واسطے ظاہر ہے کہ اگر پیداوار محنت کی مقدار زیادہ ہو گی تو دستکاروں کی اجرت بھی زیادہ ہو گی۔ اور اگر اس کی مقدار کم ہو گی تو اجرت بھی کم ہو گی۔ لہٰذا اُجرت کی مقدار دستکاروں کی تعداد کے ساتھ ایک ضروری تعلق رکھتی ہے۔ مثلاً اگر زرعی دستکاروں کی تعداد بڑھ جاوے اور زمین کی کاشت ابھی نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو، تو صاف ظاہر ہے کہ انقسام محنت کی وجہ سے پیداوار محنت کی مقدار بہت زیادہ ہو جاوے گی۔ (یہ کوئی ضرور نہیں کہ پیداوار محنت کی مقدار میں اسی نسبت سے زیادتی ہو جس نسبت سے کہ دستکاروں کی تعداد میں زیادتی ہوئی ہے بلکہ جب زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک نہ پہنچی ہو تو دستکاروں کی تعداد میں زیادتی ہو جانے کے باعث انقسام محنت زیادہ مکمل طور پر عمل کرتا ہے۔ اس واسطے پیداوار محنت کی مقدار اس نسبت سے بہت زیادہ ہو سکتی ہے) اس صورت میں چونکہ پیداوار محنت کی مقدار بڑھ گئی ہے اس واسطے ممکن ہے کہ دستکاروں کی اجرت بھی بڑھے اور سرمایے کی مقدار میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ علیٰ ہٰذا القیاس اگر زمین کی کاشت نقطۂ تقلیل تک پہنچ گئی ہے تو صاف ظاہر ہے کہ دستکاروں کی زیادتی سے پیداوار محنت فی کس کم ہو جائے گی۔ لہٰذا اجرت فی دستکار بھی کم ہو گی، خواہ سرمایے کی مقدار میں زیادتی ہی کیوں نہ ہو۔

مندرجہ بالا وجوہ سے محقق موصوف انگریزی حکماء کی رائے کو تسلیم نہیں کرتا اور اس بات پر بار بار زور دیتا ہے کہ ان کے خیال کو صحیح سمجھنا اور یہ تسلیم کر لینا کہ دستکاروں کی اجرت سرمایۂ اجرت میں سے ادا کی جاتی ہے گویا اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ دستکاروں کا ہنرمندی، دیانتداری اور دیگر اوصاف میں ترقی کرنا اگرچہ ان کی پیداوار محنت کو زیادہ کرتا ہے تاہم ان کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

کیونکہ ان کی اجرت سرمایے کی ایک معیّن مقدار سے ادا کی جاتی ہے اور اجرت کی کمی بیشی اس مقدار کی کمی بیشی پر انحصار رکھتی ہے۔ انگریزی حکماء یہ سمجھتے ہیں کہ پیداوار دولت

میں لگان اور اجرت کو نکال کر باقی جو کچھ بچتا ہے وہ اس شخص کا حق ہے، جو ساہوکار بھی ہو اور کارخانہ دار بھی۔ مگر محقق واکر کے نزدیک اجرت کی بحث لگان، سود اور منافع کی بحث کے بعد آتی ہے۔ کیونکہ اجرت پیداوار دولت کی اس مقدار کے برابر ہے جو تینوں مذکورہ حصّوں کو نکال کر باقی بچے۔ لگان کی کمی بیشی، اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتی۔ اور نہ لگان کی مقدار دستکاروں کی اجرت میں سے نکالی جاتی ہے۔ اس واسطے دستکار لگان کے کسی حصّے کا حق دار نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سود چونکہ استعمال سرمایہ کا معاوضہ ہے اور اس کی کمی بیشی ان لوگوں پر اثر کرتی ہے جو دولت کے جمع کرنے والے ہوں لہذا دستکار کو بحیثیت دستکار ہونے کے شرح سود سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ منافع بھی لگان کی طرح اشیاء کی قیمتوں پر کوئی اثر نہیں کرتا۔ اور نہ اس کی مقدار دستکاروں کی اجرت میں سے نکالی جاتی ہے۔ لہذا یہ تینوں حصّے، لگان، سود اور منافع دستکاروں کی اجرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ اور یہ ضروری ہے کہ اجرت دستکاراں کا اندازہ لگانے کے لیے پیداوار دولت کی کل مقدار میں سے پہلے ان کو وضع کر لیا جائے۔ اگر اشیاء کی قیمتوں پر ان کا اثر ہوتا تو صاف ظاہر ہے کہ دستکار کی اجرت بھی ان سے متاثر ہوتی۔ کیونکہ حقیقی اجرت سے مراد ان ضروریات زندگی یا دیگر اشیاء سے ہے جن کو دستکار زر نقد کی وساطت سے خرید کر سکیں۔ مگر چونکہ اجرت پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا اس واسطے محقق مذکور کے نزدیک تینوں حصّوں یعنی لگان، سود اور منافع کو نکال کر دولت کی پیداوار میں سے جو کچھ باقی بچے وہ دستکار کا حق ہے۔ کیونکہ ہر سبب جو پیداوار محنت کی مقدار کو زیادہ کرتا ہے حقیقت میں دستکار کے حصّے کو زیادہ کرتا ہے۔ تم شاید کہو گے کہ پیداوار محنت کی زیادتی سے زمیندار، ساہوکار اور کارخانہ دار کا حصہ کیوں نہیں بڑھتا۔ اس سوال کے جواب کے لیے فرض کرو کہ دستکار اپنے کام میں نسبتاً زیادہ چست اور کاریگر ہو گئے ہیں، جس سے پیداوار محنت کی مقدار بھی زیادہ ہو گئی ہے اور وہ مصالح بھی کم خرچ ہوتا ہے جس سے اشیاء تجارتی تیار ہوتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کس کا حق ہے؟ زمیندار کا؟ نہیں ہرگز نہیں! کیونکہ اس مصالح میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی جس کو زمین سے نکال کر اشیاء تجارتی کی

تیاری میں صرف کیا جاتا تھا۔ اس کی مقدار وہی ہے جو پہلے صرف ہوا کرتی تھی، بلکہ دستکاروں کی کفایت شعاری کی وجہ سے نسبتاً کم ہوگئی ہے۔ لہٰذا مصالحِ مذکور کی مانگ میں کوئی تغیر نہ آنے کی وجہ سے ادنیٰ درجہ کی زمینوں کو کاشت میں نہیں لانا پڑتا جس سے لگان یعنی زمیندار کے حصّے کی مقدار میں اضافہ ہو جائے۔ علیٰ ہذا القیاس یہ زیادتی ساہوکار کا بھی حق نہیں ہے کیونکہ سرمایے کی مانگ بدستور وہی ہے، جو پہلے تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ شرح سود یعنی ساہوکار کا حصّہ نسبتاً بڑھ جائے جبکہ سرمایے کی مانگ میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ بلکہ دستکاروں کا کاری گری میں ترقی کرنا ساہوکار کے حصّے کو الٹا کم کرتا ہے۔ کیونکہ کاریگر دستکار کو بالعموم اشیاء تجارت کی تیاری کے لیے اس قدر اوزاروں کی ضرورت نہیں ہوتی جس قدر کہ بھدا کام کرنے والے بے ہنر دستکار کو۔ کاریگر تھوڑے اوزاروں کی مدد سے بھی اپنا کام بخوبی کر سکتا ہے۔ لہٰذا وہ مجموعی طور پر سرمایے کی مانگ کو کم کرتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر شرح سود کو کم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اس مقدار کو استعمال میں لائے جانے سے بچاتا ہے جو بصورت دیگر اوزاروں کے بنانے میں صرف کرنی پڑتی۔ اسی استدلال کی بنا پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پیداوار محنت کی یہ زیادتی کارخانہ دار کا حق بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کارخانہ دار کا حصّہ یا منافع صرف اسی صورت میں زیادہ ہوسکتا ہے جب کہ کارخانہ داروں کی تعداد میں زیادتی ہو (یہ بات پہلے ثابت ہوچکی ہے) اور یہ کوئی ضرور نہیں کہ دستکاروں کا کاریگری میں ترقی کرنا کارخانہ داروں کی زیادتی تعداد کا مستلزم ہو۔ بلکہ دستکاروں کے ہنر اور کاری گری میں ترقی کرنے سے لیاقت انتظامی کا معیار بڑھ جاتا ہے، جس سے ناقابل کارخانہ داروں کا وجود معطل ہو جاتا ہے اور وہ دائرہ تجارت سے روز بروز خارج ہوتے جانے کا میلان رکھتے ہیں۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ کارخانہ داروں کی تعداد کم ہو جانے کے باعث ہشیار اور قابل کارخانہ داروں کا منافع کم ہو جاتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ پیداوار محنت کی زیادتی جو دستکاروں کی ذاتی ترقی سے پیدا ہوتی ہے خود دستکاروں کا حق ہے۔ زمینداروں، ساہوکاروں اور کارخانہ داروں کو اس سے کوئی واسطہ نہیں۔

باب پنجم

مقابلۂ ناکامل دستکاروں کی حالت پر کیا اثر کرتا ہے

اگرچہ موجودہ تمدن میں دستکار نظری لحاظ سے پیداوار دولت کی اس تمام مقدار کا مالک ہے جو زمیندار، ساہوکار اور کارخانہ دار کا حصّہ نکال کر باقی رہتی ہے۔ تاہم بعض اسباب کے عمل سے دستکاروں کو انتہا درجے کا نقصان پہنچ جاتا ہے اور وہ اپنا پورا حصہ حاصل کرنے سے محروم رہتے ہیں۔

۱- بسا اوقات دستکاروں میں شادیوں کی تعداد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ چند سالوں میں ان کی آبادی دگنی ہو جاتی ہے جس سے پیداوار محنت کی مقدار فی کس کم ہو جاتی ہے کیونکہ افزائش آبادی کے باعث روز بروز ادنیٰ درجے کی زمینوں کو مجبوراً کاشت میں لانا پڑتا ہے۔ فرضاً اگر پہلے بیس دستکاروں کی پیداوار محنت چالیس من غلہ ہو، تو ان کا حصّہ فی کس دو من ہو گا۔ لیکن اگر دستکاروں کی تعداد چالیس ہو جاوے تو صاف ظاہر ہے کہ ان کا حصّہ فی کس صرف ایک من رہ جائے گا۔

۲- علیٰ ہذا القیاس اصول مقابلہ کے کامل طور پر عمل نہ کرنے کے باعث بھی دستکار نقصان اٹھاتے ہیں۔ بالعموم دستکار نقل مکانی کی تکلیف گوارا کر کے ایسے مقامات میں جانا نہیں پسند کرتے جہاں شرح اجرت کی مقدار زیادہ ہو بلکہ جس جگہ حالات نے ایک جگہ لا پھینکا وہیں پڑے رہتے ہیں۔ ایک مصنّف لکھتا ہے کہ تمام اشیاء نقل مکان کر سکتی ہیں مگر انسان ایک ایسی چیز ہے کہ بڑی مشکل سے ایک مقام سے دوسرے مقام تک حرکت کرتا ہے۔ البتہ بعض ممالک میں جہاں کے لوگ قدرتاً چست اور اپنی حالت کو سنوارنے کے خواہشمند ہوتے ہیں دستکار آزادی سے نقل مکان کرتے ہیں جس سے مختلف جگہوں اور مقاموں کے دستکاروں کے درمیان اصول مقابلہ پورے طور پر عمل کرتا ہے اور اجرت کے

مقادیر میں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ بریں دستکار اپنے پیشوں کو تبدیل کرنے سے بھی بالعموم گھبراتے ہیں۔ اس غفلت یا کاہلی کی وجہ سے انھیں بسا اوقات ایسے پیشوں میں روزگار تلاش کرنا پڑتا ہے جہاں دستکاروں کی مفلسی کے اور اسباب کے علاوہ ایک یہ بھی ہے کہ تبدیل پیشہ ایک قسم کا طعن تصوّر کیا جاتا ہے۔ اگر کسی درزی سے کہو کہ اپنے بیٹے کو کفش دوزی یا آہن گری کا کام سکھلائے کیونکہ اس کام میں بوجہ قلّت افراد دستکاروں کی اجرت کی مقدار زیادہ ہے تو اس بات سے وہ گھبراتا ہے اور آہن گری یا کفش دوزی کو اپنی ذات کے خلاف سمجھتا ہے۔ مگر مقام شکر ہے کہ انگریزی تعلیم کے اثر سے یہ تمدنی نقص اب روز بروز دور ہو رہا ہے۔

اگر مقابلہ ہر طرح سے کامل ہو اور پورے طور پر اپنا عمل کر رہا ہو، تو صاف ظاہر ہے کہ اس کے اثر سے ہر دستکار اپنے ہنر کے مطابق اجرت پائے گا۔ جو شخص جس کام کی قابلیت قدرتاً رکھتا ہو گا وہی کام اس سے لیا جائے گا اور نظام تمدّن میں ہر فرد کے فرائض وہی ہوں گے جو ہونے چاہییں۔ دستکاروں کی حالت میں ایک قسم کی مساوات قائم ہو جائے گی اور وہ تمام نقصان جو مقابلۂ ناکامل کی صورت میں دستکاروں کو پہنچتے تھے دور ہو جائیں گے۔ ہم پہلے اشارۃً بیان کر آئے ہیں کہ مقابلے سے مراد اس تجارتی رقابت کی ہے جو انسان کی فطری خود غرضی کی وجہ سے کسی شے کے خریدنے اور بیچنے والوں کے درمیان پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ بات ناگوار سی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کشش ثقل کی وجہ سے اجرام فلکی کے درمیان ایک قسم کا نظم قائم ہے، اسی طرح مقابلہ بھی ایک قسم کی کشش ہے جس کے عمل سے صنعت و حرفت کے عالم میں نظام قائم ہو جاتا ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ مقابلے کے اثر سے ہر دستکار تجارت کی اسی شاخ میں کام کرے گا، جہاں اسے اجرت کی زیادہ سے زیادہ مقدار ملتی ہے، تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کا فائدہ صرف اس کی ذات تک محدود ہے بلکہ اگر دوسرے پہلو سے دیکھو تو اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مقابلے کے اثر سے ہر دستکار تجارت کی اس شاخ میں پہنچ جائے گا جہاں اس کی ضرورت زیادہ ہے۔ اگر تجارت کی کسی ایک شاخ میں کام کرنے سے کسی دستکار کی تیار کردہ شے بہ نسبت دیگر شاخوں کے زیادہ

قیمت پاتی ہے، تو صاف ظاہر ہے کہ تجارت کی اس خاص شاخ میں بہ نسبت دیگر شاخوں کے اس دستکار کی مانگ زیادہ ہے۔ اگر وہ اس شاخ کو چھوڑ کر کسی اور شاخ میں چلا جائے، تو نہ صرف نقصان اٹھائے گا بلکہ اس کی حرکت سے اوروں کو بھی نقصان پہنچے گا۔ علاوہ بریں مقابلۂ کامل کے عمل سے قدرتی اور دیگر حوادث (مثلاً قومی سرمایہ کا عظیم الشان جنگوں میں صَرف ہو جانا، فصل نہ ہونا، آتش زدگی، طوفان وغیرہ) کا اثر دستکاروں پر مساوی طور پر منقسم ہوتا ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ مقابلۂ کامل دستکار کا محافظ ہے اور ان کو بحیثیت مجموعی اس بربادی اور تباہی سے بچاتا ہے جو اس قسم کے حوادث کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ تم جو کے ایک ڈھیر پر زور سے ایک پتھر مارتے ہو۔ ظاہر ہے کہ تم اس صدمہ سے جو کے ایک منفرد دانے کو بھی نہیں کچل سکتے۔ کیونکہ دانے اِدھر اُدھر ہو جائیں گے اور پتھر ڈھیر کے اندر گھس جائے گا۔ برخلاف اس کے اگر تم ڈھیر میں سے ایک جو کو لے کر اس کے اوپر پتھر مارو، تو یہ دانہ ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ یہی حال دستکاروں کا ہے۔ اگر ڈھیر کے دانوں کی طرح ان کی حرکت بھی آزاد نہ ہو اور یہ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک پیشہ سے دوسرے پیشہ میں بلا قید منتقل ہو سکتے ہوں، تو حوادث کا اثر چونکہ سب پر مساوی تقسیم ہو جائے گا، اس واسطے کسی فرد واحد کو چنداں محسوس نہ ہو گا اور سب کے سب افراد محفوظ رہیں گے اور مزید برآں ایسے اسباب فی الفور اپنا عمل شروع کر دیں گے جن کے اثر سے وہ کمی پوری ہو جائے گی جو ان ناگہانی حوادث سے پیدا ہوئی ہو۔ غرض کہ مقابلۂ کامل اور دیگر اقتصادی اسباب کا عمل دستکاروں کی تمدّنی حیثیات کے درمیان ایک قسم کی ایسی مساوات اور ایک طرح کی ایسی یگانگت، ہم آہنگی اور اتحاد پیدا کرنے کی طرف میلان رکھتا ہے جس کے ساتھ تجارت کی ہر شاخ کی ترقی اور توسیع وابستہ ہے۔

لیکن چونکہ نفس الامر میں ایک قسم کا کامل مقابلہ کسی ملک کے دستکاروں کے درمیان نہیں ہے، اس واسطے نظام تمدّن کی موجودہ صورت میں دستکاروں کی حالت بالعموم اچھی نہیں ہے۔ موجودہ ناکامل حالت اس امر کی مقتضی ہے کہ اقتصادی اسباب کا اثر دستکاروں کا مؤید نہ ہو بلکہ مخالف ہو، جو مصیبت کا مارا زندگی کی دوڑ میں ایک دفعہ منہ کے بل گر گیا وہ پھر اٹھ

نہیں سکتا اور موجودہ حالت میں ایسے اسباب بھی موجود نہیں جن کا عمل اس بدقسمت کو سہارا دے کر اپنے پاؤں پر کھڑا کر دے۔ جب کوئی دستکار بے روزگار ہو کر مفلس ہو جاتا ہے تو بالعموم فطری خودداری اور ہم چشموں کی نگاہوں میں وقعت پیدا کرنے کی آرزو اس پر کوئی اثر نہیں کر سکتی جو قدرتاً انسان کو اوروں سے آگے بڑھ جانے کی ایک زبردست تحریک دیتی ہے۔ مفلسی کا آزار انسان کی روحانی قویٰ کا دشمن ہے اور وہ مایوسی، فکر اور غفلت شعاری، کاہلی اور فلاکت کی اور صورتیں جو اس بلائے بے درمان کے ساتھ آتی ہیں دستکار کی ذاتی قابلیت اور اس کی محنت کی کارکردگی پر ایسا برا اثر کرتی ہیں کہ اس کے کام کی وہ کیفیت اور کمیت نہیں رہتی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ ایک دفعہ کی شکست بیچارے دستکار کو ہمیشہ کے لیے کارزار زندگی کے ناقابل کر دیتی ہے۔ اور پھر یہ نہیں کہ اس شکست کا کچھ علاج ہو جائے بلکہ جدید اقتصادی اسباب کا عمل (مثلاً تجارت کی توسیع، محنت کی نئی شاخوں کا کھلنا اور ملک کی روز افزوں اقبال مندی) اس بے چارے کی حالت کو سدھار نہیں سکتا۔ لہٰذا موجودہ مقابلۂ ناکامل کی صورت میں اقتصادی اسباب کا عمل اس طرف میلان رکھتا ہے کہ نظام صنعت میں افراد کا موجودہ اختلافِ مدارج روز بروز بڑھتا جائے اور جس فرد یا جماعت کو کسی سبب سے آغاز ہی میں کوئی مصیبت دامن گیر ہو گئی اس کی حالت بدستور وہی رہے بلکہ روز بروز ابتر ہوتی جائے۔ تمدّن کی ایسی حالت میں ایک نہایت ضروری سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر نظام صنعت مقابلۂ کامل کی برکات سے خالی ہو تو اجرت کی مقدار کو بڑھانے اور دستکار کی تمدنی حالت کو سنوارنے کے واسطے کیا وسائل اختیار کرنے چاہییں۔

حکماء کا ایک طبقہ جس کو حکمائے متوکلین کے نام سے موسوم کرنا چاہیے، کہتا ہے کہ موجودہ نظام صنعت میں قوانین وغیرہ کی مدد سے کوئی دست اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کو تمام قانونی اور دیگر قیود سے آزاد کرکے اس بات پر اعتماد کرنا چاہیے کہ بالآخر جو کچھ ہو گا نوع انسان کے لیے اچھا ہو گا۔ یہ حکماء اپنے دعویٰ کے ثبوت میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ قانون کی مدد سے دستکاروں کی اجرت کا زیادہ کرنا برے نتائج پیدا کرتا ہے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی ملک کے ارکان سلطنت نے یہ قانون وضع کیا ہے کہ اجرت کی مقدار بیس

فیصد کے حساب سے زیادہ کر دینی چاہیے۔ اگر پیداوار محنت کی مقدار میں کوئی زیادتی نہیں ہوئی تو صاف ظاہر ہے کہ کارخانہ داروں کو نقصان پہنچے گا اور وہ اپنا سرمایہ دیگر ممالک میں لگا دیں گے، جہاں اس قسم کا کوئی قانون مروّج نہیں ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اگر سرکار یہ قانون وضع کر دے کہ ہر دستکار آٹھ گھنٹہ یومیہ سے زیادہ کام نہ کرے گا تو ایک صریح ناانصافی ہو گی۔ کیونکہ بعض پیشوں میں آٹھ گھنٹہ کام کرنا کوئی بات نہیں۔ مگر بعض پیشوں میں اتنے گھنٹہ یومیہ کام کرنا جسمانی صحت کے بالکل مخالف ہے۔ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہر بے روزگار دستکار کا حق ہے کہ سرکار اسے روزگار دے۔ بالفرض اگر ایسا ہو تو سرکار کو تنخواہ یا اجرت کی ادائیگی کے واسطے رعایا سے قرض اٹھانا پڑے گا اور مداخل ملکی میں کسی نہ کسی طرح زیادتی کرنی ہو گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصے کے لیے یہ طریق عمل مفید ہو گا۔ مگر اس کو مستقل طور پر اختیار کرنا انتہا درجے کا مضرت رساں ہے کیونکہ آبادی کی روز افزوں ترقی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک تمام قانونی قیود محض بے سود ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ حقیقی آزادی قیود کے دور کرنے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ بعض قیود ایسے ہوتے ہیں جن سے انسان کی آزادی کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی تماشا گاہ میں آگ لگ جائے اور ہر شخص اپنے بچاؤ کے لیے وہاں سے بھاگے تو صاف ظاہر ہے کہ دیوانہ وار ادھر ادھر بھاگنے کی نسبت اگر تماشائی کسی خاص ترتیب کے پابند ہو کر وہاں سے نکلیں تو یہ طریق عمل زیادہ محفوظ ہو گا۔ علیٰ ہذا القیاس ہر قسم کے انتقال زمین کے لیے ایک خاص تحریر اور پھر اس تحریر میں خاص خاص قانونی اصطلاحوں کا استعمال ضروری ہے جو بظاہر ایک قسم کی قید ہے، مگر حقیقت میں آزادی انتقال کو زیادہ کرتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کی قیود سے انتقال کنندہ کو ہر طرح کا اطمینان ہو جاتا ہے اور کسی قسم کا شک و شبہ نہیں رہتا۔ جس کا بصورت عدم تحریر وغیرہ اس کے دل میں پیدا ہونا ممکن تھا۔ لہٰذا دستکاروں کی حالت کو سنوارنے کا سب سے احسن طریق یہ ہے کہ دستکاروں اور کارخانہ داروں کے درمیان ہمدردی پیدا کی جائے اور یہ بات ان کے ذہن نشین کی جائے کہ قوم کی بہبودی تمام افراد کی بہبودی سے وابستہ ہے اور ایک رشتے کے ضعیف اور کمزور ہو جانے سے تمام قوم کا شیرازہ بگڑ

جانے کا اندیشہ ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک طریق معاونت پر عمل کرنا بھی دستکاروں کے لیے مفید ہے۔ کیونکہ اس طریق سے وہ منافع جو کارخانہ داروں کی جیب میں جاتا ہے دستکاروں کے قبضے میں آتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دیگر ممالک میں جاکر آباد ہونا بھی دستکاروں کی بہبودی پر ایک نمایاں اثر کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی وساطت سے کسی ایک ملک میں ان کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہمارے ملک میں سے قریباً بارہ لاکھ دستکار اس وقت جزائر میں آباد ہیں، جہاں ان کی حالت بہت اچھی ہے۔ لیکن ابھی ہندوستان کے دستکاروں کو نقل مکان کی بہت ضرورت ہے۔ مگر ہمارے نزدیک کمی اجرت کا مفید ترین نسخہ قومی تعلیم ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس سے دستکار کا ہنر، اس کی محنت کی کارکردگی اور اس کی ذہانت ترقی کرتی ہے۔ اس کے اخلاق سنورتے ہیں اور وہ اس قابل بنتا ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ تعلیم کی مدد سے دستکار اپنے کام کو سہولت کے ساتھ کر لینے کی راہیں سوچ سکتا ہے اور جدید کلوں کا استعمال جلد سیکھ سکتا ہے اور شراب خوری اور ہر قسم کی غلط کاری سے محفوظ رہتا ہے جو بالعموم جہالت اور ناعاقبت اندیشی کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

باب ششم

سرکار کا حصہ یا مال گذاری

پیداوار دولت کی کچھ مقدار ایسی بھی ہے جو نہ زمیندار اور ساہوکار کے قبضے میں جاتی ہے، نہ کارخانہ دار اور دستکار کے قبضے میں۔ یہ مقدار دو حصوّں پر منقسم کی گئی ہے۔

ا- اوّل وہ مقدار جو محصولات و مال گذاری کی صورت میں سرکاری خزانوں میں جاتی ہے۔ حکماء کے درمیان اس امر کے متعلق بڑا اختلاف ہے کہ آیا محصول سرکار کی بحث تقسیمِ دولت کے باب میں آنی چاہیے یا صرف دولت کے باب میں۔ کیا سرکار کو پیداوار دولت کا پانچواں حصہ دار تصور کرنا چاہیے یا صرف یہ سمجھنا چاہیے کہ زمیندار، ساہوکار، کارخانہ دار اور دستکار کے حصّوں میں سے کچھ مقدار انتظامی مملکت کے استحکام کے لیے سرکار کو ادا کی جاتی ہے۔ بعض حکماء کا یہ قول ہے کہ سرکار خود دولت پیدا کرتی ہے مثلاً سڑکیں بنواتی ہے، پل تیار کرواتی ہے اور دیگر رفاہ عام کی صورتوں میں سرمایہ صرف کرتی ہے۔ لہذا تقسیمِ دولت میں ایک خاص حصّے کی حق دار ہے جو محصول کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے بعض حکماء اس بات پر مصر ہیں کہ اکثر صورتوں میں سرکار کا سرمایہ غیر بار آور طور پر صرف ہوتا ہے۔ بڑی بڑی فوجیں اور جنگی جہاز رکھنے کی اصلی غرض یہ نہیں ہوتی کہ ملک میں امن و امان قائم ہو، جس سے قوم کا ہر فرد مطمئن ہو کر اپنے کام میں لگا رہے بلکہ اس ساز و سامان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ سلطنت کا دائرہ وسیع ہو اور شاہی خاندان کو استحکام اور قوت حاصل ہو۔ علاوہ بریں ادائیگی محصول کوئی تبادلہ دولت کی قسم سے نہیں ہے کہ اپنی خوشی سے سرکار کو ایک شے دی اور کوئی اور شے اس کے عوض میں حاصل کرلی۔ بلکہ رعایا کو مجبور کیا جاتا ہے کہ محصول کی کچھ نہ کچھ مقدار ادا کرے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر دو فریق راستی پر ہیں کیونکہ محصول سرکار کی بحث ایک اعتبار سے تقسیم اور دوسرے اعتبار سے صرف

دولت کے ساتھ وابستہ ہے۔ سڑکوں، پلوں اور دیگر عمارات کی تعمیر جدید، تجارتی بندر گاہوں کا افتتاح، محصول لگانے کے مختلف طریق اور اس کے جمع کرنے کے وسائل اور نیز اس امر کا فیصلہ کہ آیا کوئی خاص محصول زمین زمیندار کی ذاتی جیب سے نکلتا ہے یا حقیقت میں اس کے ادا کنندے پیداوار زمین کو استعمال میں لانے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ تمام اور اس قسم کے دیگر امور تقسیم دولت کی بحث میں آتے ہیں۔ بہ خلاف اس کے سرکاری اخراجات کے نتائج کا نیک وبد ہونا صرف دولت کی بحث میں آتا ہے۔

اگرچہ مال گذاری سرکار کی کئی صورتیں ہیں مگر اس باب میں ہم صرف دو بڑی صورتوں کا ذکر کریں گے جن پر غور کرنا ضروری ہے:

۱- محصولات زمین ۲- محصولات آمدنی

قدیم الایام سے یہ دستور چلا آیا ہے کہ فاتحین مفتوحوں کی پیداوار زمین میں سے کچھ حصّہ وصول کریں اور مختلف زمانوں میں اس حصّہ سرکار کی مقدار مختلف رہی ہے۔ مگر یہ امر عام طور پر مسلّم ہے کہ سرکار واقعی زمین کی خصوصیات کے لحاظ سے اس پر ایک خاص محصول لگانے کا حق رکھتی ہے۔ ہمارے ہاں ایک خاص میعاد کے بعد جس کی مقدار آج کل دن بدن زیادہ سے زیادہ ہوتے جانے کا میلان رکھتی ہے سرکاری طور پر زمینداروں سے محصول کی ایک خاص مقدار ادا کرتے رہنے کا ایک معاہدہ کیا[1] جاتا ہے جس کو بندوبست کہتے ہیں اور جس کی دو صورتیں ہیں:

۱- زمینداری یا تعلقداری اضلاع جہاں زمیندار خود مالگذاری ادا کرتا ہے خواہ زمین کی کاشت خود کرے خواہ اوروں سے کرائے۔

---

[1] پنجاب میں بالعموم حق ملکیت کی تین صورتیں ہیں:

(۱) زمینداری (۲) پتے داری (۳) بھیا چارہ

مقدم الذکر دو صورتوں میں تمام مالکان دہ مشترکہ طور پر مالگذاری ادا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اور تیسری صورت میں ہر حصہ دار اپنے حصہ زمین کی مالگذاری ادا کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مالکان خود کاشت بھی ہوتے ہیں جو اپنی مال گذاری فرداً فرداً خود ادا کرتے ہیں۔

۲- اضلاع رعیت داری جہاں مزارعین اپنی اپنی مالگذاری خود ادا کریں اور سرکار اور مزارع کے درمیان زمیندار کا واسطہ نہ ہو۔

آج کل ہندوستان میں بعض اہل الرائے مسئلہ مالگذاری پر بڑی گرم جوشی کے ساتھ بحث کر رہے ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان کے موجودہ افلاس و ادبار کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہاں سلسلہ بندوبست دوامی کو وسعت نہیں دی جاتی۔

دت صاحب جنہوں نے حال میں سرکار ہند کے ساتھ اس اہم مضمون پر خط و کتابت کی ہے فرماتے ہیں کہ بنگال میں بندوبست دوامی کے باعث دولت و اقبال نے ترقی کی ہے اور عام لوگوں نے خاصہ سرمایہ جمع کر لیا ہے جو مختلف قسم کی صنعتوں میں صرف ہو سکتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ مذکورہ بالا محقق کا ذاتی تجربہ اور ان کی مسلّمہ لیاقت بہت بڑی وقعت رکھتی ہے۔ مگر ہماری رائے میں بنگال کی دولت و اقبال کا باعث صرف بندوبست دوامی ہی نہیں ہے بلکہ اس کے اور بھی اسباب ہیں جن کی طرف صاحب موصوف نے توجہ نہیں مبذول فرمائی۔ مشرقی بنگال خصوصیت سے زرخیز ہے اور ایسا کم اتفاق ہوتا ہے کہ یہاں بارش بالکل نہ ہو جیسا ہندوستان کے دیگر حصوّں میں ہوتا ہے۔ علاوہ بریں صوبہ بنگال میں سن کی پیداوار ہوتی ہے جو ہندوستان میں کسی اور جگہ شاذ ہوتی ہے۔ مزید برآں ملک ہندوستان کے اس حصّے میں وسائل آمدورفت بھی بہ نسبت دیگر مقامات کے کامل ہیں۔ باوجود ان باتوں کے ایک سال بارش نہ ہوئی تو بنگال میں ایک خوفناک قحط نمودار ہوا۔ بلکہ یہاں بندوبست کو دوامی کر دینے کا موذی اثر یہ ہوا کہ زمیندار جتنا چاہتے تھے لگان لیتے تھے اور اس طرح بیچارے کاشت کاروں پر بے جا ظلم و ستم ہوتا تھا۔ ان حالات میں سرکار ہند مجبور ہوئی کہ مزارعین کے حقوق کی حفاظت کرے اور ان کو زمینداروں کے ظلم سے بچائے۔ پس اس غرض کے حصول کے لیے سرکار ہند نے کئی قانون و قواعد وضع کیے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک بنگال کی اقبال مندی زیادہ تر اس صوبے کی جغرافی خصوصیات کی وجہ سے ہے اور کچھ ان قواعد کی وجہ سے ہے جو سرکار ہند نے مزارعین کے حقوق کی حفاظت کے لیے وقتاً فوقتاً وضع کیے ہیں۔ صوبہ بہار میں بندوبست دوامی کی وجہ سے لوگوں کو ۸۰ لاکھ روپیہ سالانہ کی رعایت ہے۔ مگر باوجود

اس بات کے گذشتہ تیس سال میں وہاں دو دفعہ قحط نمودار ہوا اور لوگ اس قدر رعایت کے ہوتے ہوئے بھی قحط کا مقابلہ نہ کر سکے۔ پس یہ کہنا کلیتہً صحیح نہیں ہے کہ رقم مالگذاری کا دوامی طور پر مقرر کر دیا جانا لوگوں میں قحط کا مقابلہ کرسکنے کی قابلیت پیدا کرتا ہے۔

دوسری بڑی صورت مالگذاری سرکار کی محصولات آمدنی ہے یعنی وہ محصول جو آمدنی پر لگایا جاتا ہے۔

اکثر حکماء نے محصولات آمدنی کے متعلق کئی اصول وضع کیے ہیں مگر چونکہ یہ عملاً کچھ بہت مفید نہیں ہیں، اس واسطے ہم ان کو نظر انداز کرتے ہیں۔ یہاں صرف اس قدر ذکر کر دینا کافی ہوگا کہ انتظام مملکت کے استحکام کے لیے اس قسم کے محصولات کا ہونا ضروری ہے۔ ہاں محصول آمدنی میں اصولاً ایک یہ نقص ضرور ہے کہ آرام طلب اور سست لوگ جو کچھ نہیں کماتے اس کی ادائیگی سے بچ جاتے ہیں اور اس کا سارا بار ملک کی آبادی کے اس حصّے پر پڑتا ہے جو محنتی یا تجارت پیشہ ہوتا ہے۔

ب- اکثر تجارتی ممالک میں بعض ایسے افراد ہوتے ہیں جن کی باریک بین نگاہ تجارت کی مد وجذر کو خوب پہچانتی ہے۔ یہ لوگ اصل معنوں میں نہ تاجر ہوتے ہیں نہ کارخانہ دار، نہ خوردہ فروش نہ تھوک فروش۔ بلکہ بسا اوقات ان کے پاس اشیاء فروختنی کے بڑے بڑے ذخیرے بھی نہیں ہوتے۔ صرف اپنی باریک بینی اور تجربے سے معلوم کر جاتے ہیں کہ فلاں شے کی قیمت اتنے عرصے میں کم یا زیادہ ہو جائے گی اور اسی رائے کے بل پر اشیاء کی خرید و فروخت سے بالعموم فائدہ اور بسا اوقات نقصان بھی اٹھالیتے ہیں۔ مثلاً جب یہ دیکھتے ہیں کہ غلّے کی قیمت کچھ عرصے میں بڑھ جانے کو ہے تو جھٹ غلّے کے سوداگروں کے ساتھ سودا کر لیتے ہیں اور پھر گرانی کے موسم میں بسا اوقات عظیم الشان فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پیداوار محنت کی ایک بہت بڑی مقدار ہر سال ان لوگوں کے ہاتھوں میں سے گذرتی ہے اور اس وجہ سے قومی دولت کا کچھ حصّہ ان تاجر نما افراد کے قبضے میں جاتا ہے۔ لہذا یہ ایک لحاظ سے گویا دولت کے چھٹے حصّہ دار ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ اس قسم کے تاجروں کا وجود بالکل غیر مفید نہیں ہے کیونکہ جو شخص اپنی باریک بینی اور تجربے کی وساطت سے مثلاً یہ معلوم کر لیتا

ہے کہ فرضاً چار ماہ کے بعد غلّے کی قیمت بڑھ جائے گی اور اس رائے کی صحت کے بل پر غلّہ خریدنا شروع کر دیتا ہے، وہ ایک طرح سے اس امر کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ غلّے کی رسد زیادہ کرنے کے لیے باہر سے زیادہ غلّہ لانا چاہیے اور نیز موجودہ ذخیرے کو زیادہ کفایت شعاری سے برتنا چاہیے۔ مختصر یہ ہے کہ اگر تجارت کی یہ صورت مناسب حدود کے اندر رہے، تو اس کی وساطت سے اشیاء کی مانگ اور رسد کے درمیان مساوات پیدا ہوتی ہے اور قیمت اشیاء کے ناگہانی تغیرات کا اثر زیادہ محسوس نہیں ہوتا۔

حصۂ پنجم

باب اول

آبادی — وجہ معیشت

کسی شے کے صرف سے مراد اس شے کے استعمال سے ہے صرف شے عدم محض کا مستلزم نہیں ہے۔ مثلاً جب اینٹوں کی ایک خاص تعداد کا پل بن جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ اینٹوں کی تعداد صرف ہو گئی ہے۔ اگرچہ اس صرف سے اینٹیں بالکل فنا نہیں ہو جاتیں۔ تاہم لفظ صرف کے مفہوم میں فنا کا مفہوم شامل ہے اور صرف شے کے معنوں میں اس شے کا انعدام اور تبدیل ہیئت دونوں داخل ہیں۔

بعض حکماء یہ سمجھتے ہیں کہ صرف دولت کی بحث مضامین اقتصاد میں داخل نہیں ہے مگر یاد رکھنا چاہیے کہ مؤرخین کے لیے اس عمل کا مطالعہ صرف اسی لحاظ سے مفید ہو سکتا ہے کہ اس کے اصول اور مسائل ان اسباب پر روشنی ڈالیں جن کے عمل سے مختلف اقوام عالم کا عروج و زوال ظہور میں آتا ہے۔ اور اس جذر و مد کے بواعث معلوم نہیں ہو سکتے جب تک کہ اقوام عالم کی دولت اور اس کے صرف کرنے کے مروج طریق نہ معلوم کیے جائیں۔ علی ہذا القیاس ہم اپنی آئندہ نسلوں کی دولت کا اندازہ نہیں لگا سکتے جب تک ہم کو یہ معلوم نہ ہو کہ ہم خود کس قدر صرف کرتے ہیں اور کس طرح صرف کرتے ہیں۔ کسی قوم کی آئندہ عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ امر ضروری نہیں ہے کہ اس قوم کی موجودہ دولت کا اندازہ کیا جائے بلکہ زیادہ ضروری اس بات کا معلوم کرنا ہے کہ وہ قوم اپنی موجودہ دولت کو کس طرح صرف کرتی ہے اور اس کی عادات کس قسم کی ہیں۔ ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی

دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ اس کے دستکاروں کا ہنر اور ان کی محنت کی کارکردگی روز بروز بڑھتی جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی قوم اپنی دولت کو اس طرح صرف کرے کہ اس کے افراد کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے جس سے مفلسی اور بیماری اور دیگر بد نتائج پیدا ہوتے جائیں۔ باوجود ان صریح دلائل کے ہمیں تعجب ہے کہ بعض حکماء اس بحث کو مضامین اقتصاد میں داخل نہیں سمجھتے۔

۱۔ دولت کا پہلا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار کو سامان معیشت، لباس اور جائے رہائش ملتی ہے۔ تمدن کے ابتدائی مراحل میں دیگر حیوانات کی طرح انسان بھی صرف نباتات اور قدرتی پھل پھول پر گزارہ کرتا تھا۔ مگر انسان کے تمدن کا حقیقی سلسلہ اس دن سے شروع ہوتا ہے جب اس نے آگ کے خواص اور اس کے طریق استعمال معلوم کر کے اپنی خوراک پکانا شروع کیا۔ علیٰ ہذا القیاس رفتہ رفتہ تمدنی ترقی اس امر کی مقتضی ہوئی کہ انسان برہنہ پہاڑوں کی غاروں اور درختوں کے پتوں کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہے اور بجائے ان کے لباس، جھونپڑیوں، چمڑے کے خیموں اور مکانوں کا استعمال سیکھے۔

۲۔ دولت کا دوسرا استعمال یہ ہے کہ اس کی وساطت سے دستکار کی بی بی پرورش پاتی ہے۔ بی بی کی خواہش ایک فطری خواہش ہے اور یہ بالعموم ان خواہشوں کے پورا ہو چکنے کے بعد پیدا ہوتی ہے، جن کا پورا ہونا انسان کے جسمانی بقا کے واسطے انتہا درجے کا ضروری ہے۔ مگر بی بی انسان کے بعض قدرتی تقاضوں کو ہی پورا نہیں کرتی، بلکہ ابتدائے تمدّن میں خاوند کو اپنے کاروبار میں مدد دیتی ہے اور اس طرح اس کی پیداوار محنت پر بڑا اثر کرتی ہے۔ اکثر قدیم قومیں ایک سے زیادہ بیبیاں کرنا مستحسن تصور کرتی تھیں۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے جو اوپر مذکور ہوئی اور کچھ یہ کہ ہر قبیلہ اپنے افراد کی تعداد کو زیادہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اسے اس جنگ وجدل میں جو تمدن کے ابتدائی مراحل کا خاصہ ہوتا ہے، دیگر قبائل پر غلبہ رہے۔ تاہم یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ اقتصادی لحاظ سے تعدد ازواج تمدن کی ہر صورت میں مستحسن ہے کیونکہ اس سے آبادی بہت بڑھتی ہے جو بسا اوقات قوموں کے افلاس کا باعث ہوتی ہے۔

۳۔ صرف دولت کی تیسری صورت دستکار کے بچوں کی پرورش اور ان کی تعلیم و تربیت ہے۔ جس طرح بی بی کا ہونا دستکار کو محنت کی تحریک کرتا ہے اسی طرح بچوں کا پیدا

ہونا بھی اس کے لیے ایک مزید محرک ثابت ہوتا ہے۔ بچے کی محبت ایک فطری تقاضا ہے۔ پس باپ کا اپنے بچوں کو پرورش کرنا یا ان کی تعلیم و تربیت پر روپیہ خرچ کرنا کچھ اس خیال سے نہیں ہوتا کہ وہ بڑے ہو کر روپیہ کمائیں گے یا قوم و ملک کی استحکام کا باعث ہوں گے بلکہ اس کی محبت ایک طبعی جوش ہے جس کو کوئی شے دبا نہیں سکتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض عورتیں بانجھ ہوتی ہیں اور بعض مرد قوت مردمی سے عاری ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان کی تعداد نہایت قلیل ہے اس واسطے اس واقعہ کو نظر انداز کر کے اس صریح اصول کو یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر کسی باپ کے بچوّں کی تعداد زیادہ ہو گی اسی قدر اس کے وسائل آمدنی پر اثر پڑے گا۔ اگر کسی شخص کی آمدنی قلیل ہو اور اس کی اولاد بڑھتی جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس خاندان کی فارغ البالی وہ نہ رہے گی جو پہلے اسے حاصل تھی۔ موجودہ آمدنی تمام افراد کے گزارے کے لیے کافی نہ ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ خاندان کی جسمانی حالت میں فرق آ جائے گا اور وہ پس انداز بھی جو کسی آڑے وقت کے لیے جمع رکھا ہو گا خرچ ہو جائے گا۔ بلکہ قلّت معیشت کی وجہ سے خاندان مذکور میں بعض ایسی بیماریاں پیدا ہو جائیں گی جن کا اثر نسلاً بعد نسل منتقل ہوتا جائے گا۔ جب کسی قوم میں آبادی مناسب حدود سے زائد ہو جاتی ہے تو قدرت خود بخود وبا اور قحط کے تازیانوں سے اس کا علاج کرتی ہے۔ بچے اور بوڑھے اجل کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جوانوں کی قوت مردمی میں فرق آ جاتا ہے اور قحط بالعموم آبادی کی افزائش کو روکتا ہے۔ مگر محقق واکر کے نزدیک انسانی قبائل کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ وبا اور قحط کے وسائل کسی قوم کی آبادی کو مستقل طور پر کم نہیں کر سکتے۔ وسیع معنوں میں زندگی کا قیام ایک کلیہ قانون کے تابع ہے جس کو فلسفی قانون بقائے افراد قویہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

غالباً تمام حکمائے حال اس امر پر متفق ہیں کہ نظام عالم کا ہر حصہ اس قانون کے عمل سے متاثر ہوتا ہے۔ کیا نباتات کیا حیوانات اور کیا انسان، سب کی فنا و بقا کا اصلی راز اسی قانون کا عمل ہے تم جانتے ہو۔ قیام حیات کے وسائل و اسباب ہمیشہ متغیّر ہوتے رہتے ہیں۔ پس جب یہ اسباب و وسائل دفعتاً متغیر ہو جائیں اور جانداروں کے کسی خاص طبقے میں وسائل بقا

کے تغیر کے ساتھ ہی ان کے مطابق تبدیلی پیدا کرسکنے کی صلاحیت نہ ہو، تو صاف ظاہر ہے کہ وہ طبقہ فنا ہو جائے گا۔ اور وہی حیوان محفوظ رہیں گے جو ان وسائل متغیر شدہ میں قائم رہنے کی قابلیت رکھتے ہوں گے۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی ملک کی آب وہوا میں دفعتاً اس قسم کی تبدیلی پیدا ہوگئی ہے جو چارپایوں کے حق میں نہایت مضر ہے۔ اس حالت میں صرف وہی چارپائے زندہ رہ سکیں گے جن کے قویٰ میں تبدیل شدہ آب و ہوا کے متحمل ہوسکنے کی قابلیت ہو گی۔ باقی سب فنا ہو جائیں گے۔ غرض کہ نظام عالم کے ہر حصّے میں جانداروں کے درمیان ایک قسم کی مصاف ہستی شروع ہے جس میں قوی افراد فتح پاتے ہیں اور ضعیف و ناتواں افراد صفحۂ عالم سے معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ مگر محقق واکر کہتا ہے کہ انسان کی بقاو فنا کی صورت میں یہ قانون کامل طور پر عمل نہیں کرسکتا اور وبا و قحط سے جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ہیں، انسانوں کی تعداد میں کوئی مستقل کمی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک انسان اور دیگر حیوانوں میں ایک بڑا فرق ہے، جو انسان کو اس قانون کے عمل سے آزاد کرتا ہے۔ حیوانوں اور دیگر جانداروں میں جب بچہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کو اپنے ماں باپ سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ مگر انسان کی حالت اس سے مختلف ہے۔ نسبی تعلق جو تمدن انسانی میں خاندان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ایک ایسا زبردست رشتہ ہے جو ایک فرد کو دوسرے افراد سے جدا نہیں ہونے دیتا۔ جانداروں کے کسی طبقے کا کوئی فرد اگر کسی دکھ درد میں مبتلا ہو جائے، تو باقی افراد کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی، مگر انسانی خاندان کے کسی فرد کو اگر کوئی مرض لاحق ہو جائے تو باقی افراد نہایت خلوص اور محبت سے اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کو موت کے پنجے سے چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لہذا وہ مصاف زندگی جو اور حیوانات میں بوجہ اجنبیت و غیریت جاری ہے انسانی قبائل میں بوجہ یگانگت اور تعلقات نسبیہ کے معدوم ہے۔ اس استدلال سے محقق موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ انسانی زندگی بوجہ اس یگانگت کے جو تعلقات نسبیہ سے پیدا ہوتی ہے مذکورہ بالا قانون کے عمل سے کلی طور پر آزاد ہے۔ مگر ہماری ذاتی رائے حکیم موصوف کے خلاف ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ نسبی تعلقات کی وجہ سے انسان اپنے خاندان کے کمزور اور ناتواں افراد کی حفاظت کرتا ہے اور مختلف افراد انسانی کے درمیان وہ اجنبیت اور غیریت نہیں ہے جو حیوانوں کو قانون افراد

قویہ کے تحت لاتی ہے۔ تاہم یہ اجنبیت اور غیریت مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں کے درمیان ضرور موجود ہے۔ اگرچہ ایک خاندان کے افراد کے درمیان نہیں ہے۔ حکیم موصوف کا خیال اس صورت میں صحیح ہو سکتا ہے جب تمام انسان یہ محسوس کریں کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ اور نہ صرف یہ محسوس ہی کریں بلکہ عملی طور پر اس کو کر کے بھی دکھادیں۔ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ تمدن انسانی کی سب سے اعلیٰ صورت یہی ہے کہ تمام بنی نوع انسان حقیقی بھائیوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ مگر چونکہ نفس الامر میں ایسا نہیں اس واسطے وہ اجنبیت اور غیریت جو حیوانوں میں موجود ہے اور جو ان کو مذکورہ بالا قانون سے متاثر کرتی ہے مختلف انسانی خاندانوں اور قوموں میں بھی موجود ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ حیوانات میں مصاف زندگی افراد کے درمیان جاری ہے مگر انسانوں میں یہ لڑائی خاندانوں اور قوموں کے درمیان جاری ہے۔ ہر خاندان اور ہر قوم اس مصاف ہستی میں فتح مند ہونے کی خواہش کرتی ہے اور سب کا یہ قدرتی اور فطری تقاضا ہے کہ حریف کو گرا کر تمام روئے زمین کے خود وارث بن جائیں۔ جس طرح اس قانون کے اثر سے حیوانوں کی بعض قدیم قسمیں صفحۂ ہستی سے معدوم ہو گئی ہیں اسی طرح اس قانون کے عمل سے انسانوں کی قدیم قومیں بھی حرف غلط کی طرح کتاب ہستی سے مٹ گئی ہیں۔ اور اب ان کا نام ونشان بھی باقی نہیں رہا۔ بلکہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غیر مادی اشیاء مثلاً خیالات و مذاہب کا قیام بھی اسی قانون کے تابع ہے۔ جو خیال یا مذہب انسان کے تمدّنی حالات اور اس کی عقلی ترقی کے ساتھ ساتھ ترقی نہ کر سکے گا ضرور ہے کہ وہ انسان کی جدید روحانی ضروریات کو پورا نہ کر سکنے کے باعث معدوم ہو جائے۔ پس ہماری رائے میں مذکورہ بالا قانون انسانی قبائل کی صورت میں بھی اپنا عمل بدستور کر رہا ہے۔ اور قحط و وباء اور آبادی کو کم کرنے کے دیگر قدرتی وسائل کو جو اس قانون کے عمل کی صورتیں ہیں اگر اس پہلو سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں تمدن انسانی کی ترقی کے لیے نہایت ضروری شرائط ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے یہ ثابت کیا ہے کہ آبادی کا مناسب حدود سے باہر نکل جانا افلاس اور دیگر بدنتائج کا سرچشمہ ہے۔ مگر عملی نتائج پر پہنچنے کے لیے یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ انسانی موت و پیدائش کے درمیان صحیح نسبت کیا ہے۔ یہ ایک ظاہر واقعہ ہے کہ بعض پیدا

ہوتے ہیں بعض مرتے ہیں۔ لیکن مشاہدے اور تجربے کی مدد سے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ معمولی اموات وغیرہ کو نکال کر شرح پیدائش فی زن و مرد کیا ہے۔ حکیم مالتھس اپنے مضمون موسوم بہ "آبادی" میں یہ اصول دریافت کرتا ہے کہ باوجود تجرید اور ضعف مردمی کے جو بعض صورتوں میں ہوتا ہے انسان کی شرح پیدائش بحساب اوسط بالعموم چار بچے فی زن و مرد کے حساب سے ہوتی ہے۔ اور اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ آئندہ نسلوں کی قوت توالد و تناسل میں کوئی ضعف نہیں عارض ہوگا تو صاف ظاہر ہے کہ نوع انسان کی آبادی کا شجر مندرجہ ذیل طریق پر شاخ در شاخ ہو کر بارآور ہوتا جائے گا۔

۲- مرد عورت کا ایک جوڑا جو حکیم مالتھس کے نزدیک بالعموم چار بچے پیدا کرتا ہے یعنی بحساب اوسط ۲ لڑکیاں اور ۲ لڑکے یا بالفاظ دیگر یوں کہو کہ ایک جوڑے سے دو جوڑے پیدا ہوتے ہیں۔

۴-

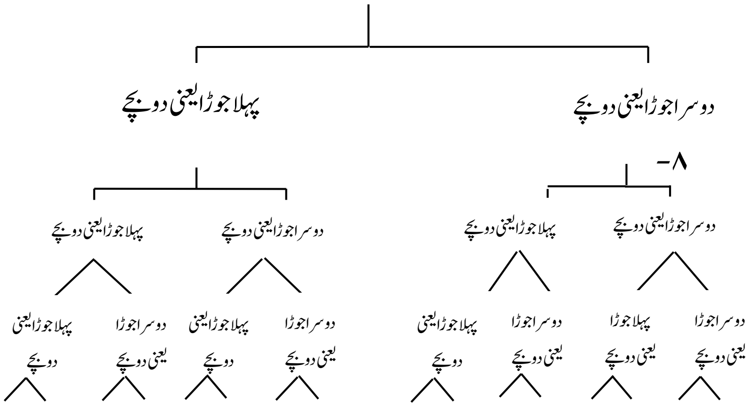

۶۴ ....

۱۲۸ ....

۲۵۶ ....

۵۱۲ ....

اس سلسلے پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر ہندسہ اپنے مقدم سے دگنا ہے پس یہ وہ سلسلہ ہے جو اصطلاح ریاضی میں سلسلہ ہندسیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لہذا نوع انسان کی آبادی بشرطیکہ کوئی اختیاری یا غیر اختیاری اسباب مانع نہ ہوں سلسلہ ہندسیہ کے مطابق برابر بڑھے گی۔ مگر برخلاف اس کے تم پیچھے پڑھ آئے ہو کہ پیداوار زمین یعنی خوراکِ انسانی قانون تقلیل حاصل کے زیر اثر ہے اور اس کی مقدار روز بروز کم ہونے کی طرف میلان رکھتی ہے۔ لہذا اس واقعہ سے حکیم موصوف یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ نوع انسان کی آبادی اس قدر بڑھ جانے کا میلان رکھتی ہے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل اس کے لیے کفایت نہیں کرسکتے۔ ذرا خیال تو کرو اگر نوع انسان کی آبادی بغیر کسی قید کے بڑھ جائے اور انسان اپنی عقل خداداد کی وساطت سے اپنے وسائل زندگی کو زیادہ کرنے کی راہیں نہ سوچے تو بنی آدم کا کیا حشر ہوگا۔ فطرتاً انسان اس قسم کی ہستی ہے کہ اس کے قویٰ نظام قدرت کے ان قویٰ کا مقابلہ کرسکتے ہیں جو اس کے قیام زندگی کے مخالف ہوں۔ قدرت عظیم الشان جنگوں، وباؤں اور قحطوں کی وساطت سے خودبخود آبادی انسان و حیوان کو کم کرتی ہے اور انسان اپنی انجام بینی کی وجہ سے اپنے شہوانی قویٰ پر غلبہ پاسکتا ہے یا افزائش آبادی کے میلان کو اختیاری طور پر بھی روک سکتا ہے۔ حکیم مالتھس کے نزدیک افلاس اور دیگر برائیوں کا اصل منبع آبادی کا اندازسے زیادہ بڑھ جانا ہے۔[1] اکثر ممالک کے مشاہدے سے معلوم ہوا ہے کہ نوع انسان کی آبادی پچیس سال میں دگنی ہوجانے کا میلان رکھتی ہے۔ جب یہ حال ہو تو جس ملک میں آبادی بلاقید بڑھ رہی ہو وہاں کے لوگوں کو چاہیے کہ انجام بینی سے کام لیں اور ان وسائل کو اختیار کریں جو آبادی کی ترقی کو روکتے ہیں۔ انسان کی قوت توالد و تناسل قدرتاً کچھ اس قسم کی ہے کہ اگر اس کے عمل کو اختیاری یا غیر اختیاری اسباب سے روکا نہ

---

[1] محقق سپنسر نے حکیم مالتھس کے اصول آبادی پر ایک نہایت دلچسپ بحث کی ہے جس میں محقق موصوف نے علم الابدان کی رو سے اس کی کلّیت سے انکار کیا ہے البتہ اس قدر تسلیم کیا ہے کہ تمدنی ترقی کے خاص مراحل میں اصول مذکور صحیح ہے۔ کیونکہ یہ بحث علم الاقتصاد کے مبتدی کی سمجھ میں نہیں آسکتی اس واسطے اسے نظر انداز کرتے ہیں۔

جائے تو اس کا وجود مجموعی طور پر بنی آدم کی بربادی اور تباہی کا باعث ہو گا۔ اجرت کی بحث میں بالعموم یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ جب دستکار افزائش آبادی کے بدنتائج کو محسوس کریں گے تو خود بخود ایسے وسائل اختیار کریں گے جن سے آبادی کم ہو۔ مگر تجربہ اس بات کے خلاف ہے۔ چین اور ہندوستان کی موجودہ حالت یہ ظاہر کرتی ہے کہ غریبی اور افلاس کی صورت میں انسان کی قوت تناسل و توالد مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے جس سے آبادی زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھتی اور مفلسی کے درد کی شدت کو اور زیادہ جان فرسا بناتی ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افزائش آبادی کا قدرتی علاج یعنی قحط ان ممالک کو آئے دن ستاتا رہتا ہے۔

جدید ضروریات کا پیدا ہونا

نوع انسانی کی آبادی کے متعلق مندرجہ بالا خیالات اوّل اوّل حکیم مالتھس نے ظاہر کیے تھے۔ حکیم موصوف نے تجربے، مشاہدے اور تاریخی شہادت سے اس امر کو ثابت کیا کہ:

۱- ہر ملک میں آبادی اس قدر بڑھ جانے کا میلان رکھتی ہے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل یعنی خوراک وغیرہ کی مقدار اس کے لیے کفایت نہیں کر سکتی۔

۲- بہت کم قومیں اس افزائش آبادی کو روکنے کے قابل ہوئی ہیں۔

۳- اگر آبادی اس قدر بڑھ جائے کہ قیام زندگی کے قدرتی وسائل یعنی خوراک وغیرہ کی مقدار اس کے لیے کفایت نہ کرے تو انسان کی قوت توالد و تناسل بجائے اس کے کہ اس کا عمل کم ہو مزید زور کے ساتھ عمل کرتی ہے اور آبادی کی مقدار کو اور زیادہ کرتی ہے۔

۴- اگر فراغت سے زندگی گذارنے کا خیال افزائش آبادی کو روکنے سے قاصر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ مفلسی اور احتیاج کا خوف بلکہ حقیقی طور پر افلاس کی بیماری میں مبتلا ہو جانا بھی اس کو روک سکے۔

۵- دنیا کی کوئی قوم ان مصائب کے اندیشے سے آزاد نہیں ہے جو افزائش آبادی سے پیدا ہوتے ہیں۔

ان ضروری قضایا کو ثابت کرنے کے بعد حکیم مالتھس ان موانع کا ذکر کرتا ہے جو افزائش آبادی کو روکتے ہیں۔ اگر یہ اسباب نہ ہوتے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ دنیا دکھ درد کا ایک ایسا خوفناک نظارہ ہوتی کہ کسی دردمند دل کو اس کے دیکھنے کی تاب بھی نہ ہوتی۔ بلکہ ان اسباب کے ہوتے بھی کثیر التعداد بنی آدم غریبی کے روز افزوں دکھ میں مبتلا ہیں جس کی

شدّت سے مجبور ہو کر ان کو ایسے ایسے جرائم کا مرتکب ہونا پڑتا ہے جو انسان کے لیے ذلّت و شرم کا باعث ہیں اور اس کی صحیح فطرت کے صاف اور روشن آئینہ کو تیرہ و تار کرنے کے لیے کافی ہیں۔ تم جانتے ہو مفلسی تمام جرائم کا منبع ہے۔ اگر ایسی بلائے بے درماں کا قلع قمع ہو جائے تو دنیا جنت کا نمونہ نظر آئے گی اور چوری، قتل، قمار بازی اور دیگر جرائم جو اس دہشت ناک آزار سے پیدا ہوتے ہیں یک قلم معدوم ہو جائیں گے۔ مگر موجودہ حالات کے رو سے اس کالی بلا کے پنجے سے رہائی پانے کی یہی صورت ہے کہ نوع انسان کی آبادی کم ہو تا کہ موجودہ سامان معیشت کفایت کر سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر نئے نئے جزائر دریافت ہوتے جائیں جہاں انسان جاکر آباد ہو سکے اور قانون تقلیل حاصل کے اثر کا مقابلہ کامل طور سے کیا جاسکے تو آبادی کی افزائش آسائش انسانی میں خلل انداز نہ ہو سکے گی۔ مگر چونکہ زمین کمیت میں محدود ہے اور اس کی پیداوار کچھ نہ کچھ قانون مذکور کے تابع ہے اس واسطے ضرور ہے کہ افزائش آبادی کے خوفناک نتائج ہمارے آرام و آسائش کے مخل ہوں اور ہمیں اس فراغت سے محروم کر دیں جو بصورت کمی آبادی ہم کو حاصل ہوتی۔ لہذا ہمارا فرض ہے کہ ہم کمی آبادی کے ان اسباب کو عمل میں لائیں، جو ہمارے اختیار میں ہیں کہ ان اسباب کا عمل قدرتی اسباب کے عمل سے متحد ہو کر آبادی انسان کو کم کرے اور دنیا مفلسی کے دکھ سے آزاد ہو کر عیش و آرام کا ایک دلفریب نظارہ پیش کرے۔ حکیم مالتھس کے نزدیک آبادی انسان کی ترقی کو روکنے کے وسائل دو قسم کے ہیں:

۱- قدرتی یا غیر اختیاری وسائل مثلاً وبا، قحط اور جنگ وغیرہ۔

۲- اختیاری مثلاً افراد انسانی کا شادی سے باز رہنا اور اپنے تقاضائے نفسانی اور جذبات فطری کو قابو میں رکھنا اور دیر کے بعد شادی کرنا۔ اگر ان وسائل کو اس طرح اختیار کیا جائے کہ افزائش آبادی پر ان کا پورا اثر ہو تو قدرتی وسائل یعنی قحطوں اور وباؤں کا تو اثر خود بخود کم ہو جائے گا کیونکہ قحط خوراک کھانے والوں کی کثرت سے پیدا ہوتا ہے اور وبا مفلسوں کی کمی خوراک اور ان کی جائے رہائش ولباس وغیرہ کے غیر مصفا ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

تمدن کے ابتدائی مراحل میں انسانی ضروریات بہت محدود تھیں۔ مگر تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی ضروریات کا دائرہ بھی وسیع ہوتا جاتا ہے۔ جہاں پہلے صرف خوراک کی خواہش تھی جب یہ پوری ہوئی تو انسان کو مکانوں کی آراستگی اور ان کے نقش و نگار کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ ہر جدید خواہش یہ تقاضا کرتی ہے کہ انسان اپنی کسی اور خواہش کو دبائے رکھے اور اس کو پورا کرے۔ لہذا انسان اپنی جدید خواہشوں کے پورا کرنے کی دھن میں اپنی پہلی ضروریات کو محدود کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بالعموم اپنی قوت توالد و تناسل کو بھی کفایت شعاری سے بدلنے لگتا ہے۔ موجودہ زمانے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے بیٹوں کی شادیاں نہیں کرتے جب تک کہ وہ تعلیم سے فارغ نہ ہولیں۔ بیٹے کی تعلیم کو اس کی شادی پر مقدم سمجھتے ہیں بلکہ بسا اوقات اس خیال کا محرک یہی امر ہوتا ہے کہ بیٹے کی شادی ہوگئی تو اولاد پیدا ہونی شروع ہو جائے گی اور بیٹے کو اپنے بچوں کی پرورش کے خیال سے تعلیم کو خیر باد کہنا پڑے گی۔ صاف ظاہر ہے کہ شادی کو اسی طرح معرض التوا میں ڈالنا گویا اولاد کی تعداد کو کم کرنا ہے جو بصورت دیگر ایام کتخدائی میں پیدا ہونی ممکن تھی۔ علاوہ بریں تہذیب و تمدّن کی ترقی کے ساتھ انسان کو مختلف اقسام کے خورد و نوش اور طرح طرح کے اسباب تن آسانی کی بھی خواہش ہوتی ہے جو اسے محنت کرنے پر آمادہ کرتی ہے اور اس کی قوت تناسل و توالد پر وہ زبردست اثر کرتی ہے، کہ مفلسی کا خوف بھی وہ اثر نہیں کر سکتا۔ کیونکہ امیرانہ ٹھاٹھ سے گزارہ کرنا انسان کی ایک جبلی خواہش ہے اور بسا اوقات یہ خواہش اس کو اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کو پورا کرنے سے روکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس بعض ممالک میں جہاں کی زمین بالعموم چھوٹے چھوٹے مالکان خود کاشت میں منقسم ہے زمیندار زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جس قدر اولاد کی تعداد زیادہ ہوگی اسی قدر ان کی جائیداد زیادہ حصوں میں منقسم ہوگی۔ اور اگر ان کی اولاد کے ہاں بھی اولاد پیدا ہونا شروع ہوگئی تو حصّہ زمین کی وہ قلیل مقدار ان کے گزارے کے لیے کسی طرح کافی نہ ہوگی۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ افزائش آبادی کو روکنے کی خواہش زیادہ زور کے ساتھ اسی صورت میں عمل کرتی ہے جب کہ زمین کی کاشت نقطہ تقلیل تک پہنچ گئی ہو یا بالفاظ دیگر جب انسان کو یہ خیال ہو کہ

سامان معیشت کی مقدار کافی طور پر مہیا نہ ہوسکے گی۔ اس اصول کی رو سے تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ ہندوستان کی موجودہ حالت کس امر کا تقاضا کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں سامان معیشت کم ہے اور آبادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ قدرت قحط اور وبا سے اس کا علاج کرتی ہے۔ مگر ہم کو بھی چاہیے کہ بچپن کی شادی اور تعدد ازدواج کے دستور کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں۔ اپنے قلیل سرمایے کو زیادہ دور اندیشی سے صرف کریں۔ صنعت و حرفت کی طرف توجہ کر کے ملک کی شرح اجرت کو زیادہ کریں اور عاقبت بینی کی راہ سے اپنی قوم کے انجام کی فکر کریں تا کہ ہمارا ملک مفلسی کے خوفناک نتائج سے محفوظ ہو کر تہذیب و تمدن کے ان اعلیٰ مدارج تک رسائی حاصل کرے جن کے ساتھ ہماری حقیقی بہبودی وابستہ ہے۔ ان سطور سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم بنی آدم کو کلی طور پر شادی وغیرہ کی لذت اٹھانے سے روکنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف اس قدر ہے کہ بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا ہو اور بی بی کی خواہش ایک فطری تقاضا ہے اور اس کو بالکل دبائے رکھنا بھی صحت کے خلاف ہے۔ لہذا اقتصادی لحاظ سے انسان کی بہبودی اسی میں ہے کہ وہ حتی المقدور اپنی حیوانی خواہشوں کو پورا کرنے سے پرہیز کرے اور جہاں تک ممکن ہو بچوں کی کم سے کم تعداد پیدا کرے۔ یہ مطلب بڑی عمر میں شادی کرنے یا بالفاظ دیگر شرح پیدائش کو کم کرنے اور نفسانی تقاضوں کو بالعموم ضبط کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔

باب سوم

صرفِ دولت

مضمون گذشتہ کی تصریح کی رو سے جدید ضروریات جو پیدا ہوتی ہیں اس امر کا تقاضا کرتی ہیں کہ انسان اپنی فطرت کے حیوانی تقاضوں کے پورا کرنے کی طرف نسبتاً کم توجہ کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آبادی کے سیل رواں کو مسدود کرنے کے لیے کسی زیادہ زبردست روک کا ہونا ضروری ہے۔ تاہم موجودہ حالت میں جدید ضروریات کا پیدا ہوتے جانا کسی اور روک کے نہ ہونے سے اچھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی محققین کے نزدیک جہاں تک ممکن ہو سامان معیشت ارزاں نہیں ہونا چاہیے۔ کیونکہ حکیم مالتھس کے مسائل کی رو سے اشیاء خوردنی کی ارزانی افزائش آبادی کے خوفناک نتائج کی طرف سے انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور یہ بے فکری اس کی آئندہ بہبودی کی دشمن ہوتی ہے۔ اگر لوگوں کے روزمرّہ استعمال کی اشیاء ارزاں سے ارزاں ہوں تو صاف ظاہر ہے کہ ایک سال فصل کے نہ ہونے سے ان کی جان پر آ بنے گی۔ کیونکہ ان کا گذارا پہلے ہی سے ایسی اشیاء پر تھا جو تمام دیگر اشیاء کی نسبت ارزاں تھیں اور اب اس آڑے وقت کے لیے کوئی ارزاں تر شے نہ ہو گی جس پر وہ اپنا گذارہ کر سکیں۔ لیکن اگر ان کے استعمال کی چیزیں ذرا گراں قیمت ہوں تو قحط سالی میں وہ ارزاں اشیاء پر اپنا گذارہ کر سکیں گے۔ کشمیر میں چاول سب سے ارزاں شے ہوتی ہے اور لوگ بالعموم اسی شے پر گزارہ کرتے ہیں۔ لیکن جس سال چاول نہیں ہوتے ان کو سخت مصیبت کا سامنا ہوتا ہے کیونکہ اس آڑے وقت میں ان کو کوئی ایسی شے دستیاب نہیں ہو سکتی جو چاولوں سے زیادہ ارزاں ہو اور جس پر وہ اپنا گذارہ کریں۔ جو سب سے ارزاں شے تھی وہ پہلے ہی ان کے استعمال میں تھی۔ اب اس سے زیادہ ارزاں شے کہاں سے آئے۔ لہٰذا ان حکماء کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ لوگوں کی اشیائے خوردنی ارزاں ترین اشیاء نہ ہوں

بلکہ کسی قدر گراں قیمت اشیاء ہوں تا کہ اگر ان گراں قیمت اشیاء کا قحط پڑ جائے تو ان ایام میں وہ سستی اشیاء پر اپنا گذارہ کر سکیں۔ حکیم مالتھس کے مسائل کا یہ نتیجہ صحیح ہے لیکن اگر عوام اپنا نفع نقصان سمجھ کر اپنی رضا و رغبت سے آبادی کو کم رکھنے کی کوشش کریں تو صاف ظاہر ہے کہ سامان معیشت اور اشیائے خوردنی کی ارزانی بجائے اس کے کہ برے نتائج پیدا کرے ان کے حق میں ایک نعمت ہو گی۔ کیونکہ جو روپیہ کھانے پینے سے بوجہ ارزانی کے بچ رہے گا وہ دیگر آرام و آسائش کے سامانوں پر صرف ہو سکے گا یا بطور سرمایہ کام آسکے گا۔ صرف دولت کی مختلف صورتوں کا معلوم کرنا خصوصاً اس حالت میں جب کہ لوگ اپنا نفع نقصان سوچ کر اپنی رضا و رغبت سے آبادی کو کم کرنے کی کوشش کریں انتہا درجہ ضروری ہے۔ کیونکہ صرفِ دولت کی مختلف صورتیں گویا مختلف اسباب ہیں جو دولت کی آئندہ پیدائش پر اثر کرتے ہیں۔ موجودہ محققین اقتصاد کا سب سے بڑا فرض اس بات کا علم حاصل کرنا ہے کہ دولت کے استعمال کے وہ کون کون سے طریق ہیں جن سے تمدن کا شیرازہ مضبوط ہوتا ہے۔ افراد قوم کی اخلاقی اور جسمانی حالت ترقی کرتی ہے اور بحیثیت مجموعی ملک کے سیاسی اور اقتصادی نظام کے تمام اجزاء ہم آہنگ ہو کر قوم کی بہبودی کا باعث ہوتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس یہ دریافت کرنا بھی ضروری ہے کہ صرف دولت کی کون کون سی صورتیں تمدّنی اور اخلاقی لحاظ سے انسان کی فطرت پر برا اثر کرتی ہیں اور پیدائش دولت کے پیچیدہ اسباب کو پورا عمل کرنے سے روکتی ہیں۔ انگلستان میں اس وقت دو ارب ساٹھ کروڑ روپیہ سالانہ صرف شراب پر خرچ ہوتا ہے۔ اگر یہی روپیہ کسی اور مفید صورت میں صرف ہوتا تو ملک کی اقتصادی حالت پر نہایت اچھا اثر کرتا۔ موجودہ زمانے میں ایک ایسے فلسفی کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے جو مندرجہ بالا امور کی پوری تفتیش اور تحقیق کر کے علم الاقتصاد کے اس حصّے کو پورا کرے۔

ضمیمہ

ان معاشی اصطلاحات کا انگریزی ترجمہ جو اس کتاب میں استعمال ہوئی ہیں:

Agent	عامل۔کارندہ
Alternative Standard	متبادل معیار
Arhuration	ثالثی۔پنچایت
Assets	اثاثہ
Balance of Trade	توازن تجارت
Bank	بنک
Banking	بنک کاری
Barter	جنسی تبادلہ
Bill of Exchange	ہنڈی
Broker	دلال
Brokerage	دلالی
Bullion	فلز
Business Organisation	کاروباری تنظیم
Capital	اصل سرمایہ
Capital Expenditure	مصارف اصل، مصارف سرمایہ
Capitalism	اصل دارانہ نظام
Circulating Capital	سرمایہ دائر
Circulating Medium	گشتی زر۔چالو زر

Clearing House	تبادلہ گاہ
Coin	سکّہ
Coinage	سکّہ زنی
Communism	اشتمالیت (اشتراکیت)
Competition	تجارتی رقابت، مقابلہ
Concentration	ارتکاز
Consumer	صارف
Consumption	دولت کا صرف یا استعمال
Convertible	بدل پذیر
Convertible Paper Money	زر کاغذی متبدل
Cooperative Principle	اصول امداد باہمی
Cost	لاگت
Cost of Coinage	حق الضرب
Cost of Production	مصارف پیدائش
Cost of Transport	مصارف باربرداری
Cost Price	لاگتی قیمت
Cottage Industries	گھریلو صنعت
Credit	ساکھ، اعتبار، قرض
Credit Instrument	دستاویز اعتبار
Current Price	قیمت متعارف
Debt	قرضہ
Distribution	دولت کی تقسیم
Debt, Public	سرکاری قرضہ

Demand	طلب
Demand Price	قیمت طلب
Differential Comparative Cost	اختلاف مصارف متقابلہ
Discount	متی کاٹا
Disequilibrium	عدم توازن
Divisibility	تقسیم پذیری
Division of Labour	انقسامِ محنت
Duty	محصول
Economic Rent	معاشی لگان
Efficiency	کارکردگی
Elasticity	لوچ۔لچک
Elasticity of Demand	طلب کا لوچ (لچک پذیری)
Elasticity of Supply	رسد کا لوچ (لچک پذیری رسد)
Employer	آجر
Equilibrium Price	قیمت صحیحہ
Exchange	دولت کا تبادلہ
Exchange Goods	اشیاء قابل تبادلہ
Exploration	استحصال
Export Import Duty	محصول درآمد و برآمد
Face Value	عرفی قیمت
Factors of Production	عاملین پیداوار
Fertility	زرخیزی
Finance	مالیات

Fiscal	محصولی
Fixed Capital	سرمایہ قائم
Foreign Exchange	تبادلہ خارجہ
Foreign Trade	خارجی تجارت
Free Coinage	آزاد سکّہ سازی
Free Competition	آزاد مسابقت
Free Goods	اشیائے آزاد
Free Trade	آزاد تجارت
Fund	ذخیرہ۔صندوق
Geometric Progression	سلسلہ ہندسیہ
Gold Standard	معیار طلاء
Gross Interest	سود کاذب
Gross Profit	خام منافع
Gross Revenue	خام آمدنی
Imperfect Competition	مقابلہ ناکامل
Import	درآمد
Income Tax	محصول آمدنی
Inconvertible Paper Money	زر کاغذی غیر متبدل
Industrialism	صنعتیت
Inflation	افراط زر
Interest	سود
International Trade	بین الاقوامی تجارت
Intrinsic Value	قیمت ضربی

Issue	اجراء
Labour	محنت
Labourer	محنتی
Land Revenue	مالگزاری
Law of Diminishing Utility	قانون تقلیل افادہ
Law of Diminishing Returns	قانون تقلیل اصل
Legal Tender	نقد قانونی
Liability	ذمہ داری، دین داری
Luxuries	تعیشات
Margin	حد
Margin of Cultivation	کنارہ زراعت
Marginal	حدی۔ مختتم
Marginal Utility	افادت انتہائی
Market	بازار
Measure of Value	پیمانہ قدر
Mercantilism	نظامِ تجارت
Metallic Value	دھاتی قدر۔ فلزاتی قدر
Mineral Resources	معدنی ذرائع، معدنی وسائل
Mobility	نقل پذیری
Money	زر
Monopoly	اجارہ
Mortgage	رہن
Mortgager	مرتہن

Mortgagee	راہن
Nationalization	قومی ملکیت بنانا، قومیانہ
National Wealth	قومی دولت
Necessaries	ضروریات
Net Interest	خالص سود
Net Revenue	خالص آمدنی
Nominal Value	ظاہری قدر
Nominal Wages	ظاہری اُجرت
Optimum Point	نقطہ تقلیل
Output	مقدار (کام یا پیداوار کی)
Over-Population	کثرت آبادی
Paper Money	زر کاغذی
Parity of Exchange	شرح مبدل
Peasant Proprietor	مالک کاشتکار، خود کاشت زمیندار، فلاح
Personal Wealth	ذاتی دولت
Planning, Economic	معاشی منصوبہ بندی
Positive Checks	اثباتی روک
Preventive Checks	انسدادی روک
Price	قیمت
Productive	دولت آفریں
Productivity	قابلیت پیداوار
Production	دولت کی پیدائش
Profit	منافع

Property	جائیداد
Protection (of trade) or Protective Trade	حفاظت تجارت یا تامین تجارت
Public Debt	سرکاری قرضہ
Public Finance	مالیات
Public Revenue	محصول آمدنی
Raw Material	مصالحہ
Real Wages	حقیقی اُجرت
Rent	لگان
Retail	خوردہ فروشی
Revenue	آمدنی، محاصل
Saving	بچت
Scarcity	دقت حصول
Skill	مہارت
Specialisation	تخصیص
Standard of Deferred Payment	ادائیگی غیر مؤجل کا معیار
Standard of Value	معیار قدر
Stocks	ذخیرے
Supply	رسد
Surplus	فاضلی
Tax	محصول
Taxation	محصول بندی
Technology	علم صنعت
Token Money	زر علامتی

Trade Cycle	تجارتی چکر
Usury	ربا
Utilities	مفیدات
Utility	افادت
Utility, Form	قدر مختص بالہیئۃ
Utility, Place	قدر مختص بالمکان
Utility, Time	قدر مختص بالزمان
Value	قدر
Velocity of Circulation	سرعت انتقال
Wage	اُجرت
Want	احتیاج
Wealth	دولت
Working Capital	کاروباری سرمایہ